جلد ۸۸ فروری ۱۹۷۸ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۸ | فروری ۱۹۷۸ء مطابق صفر ۱۳۹۸ھ | عدد ۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۱۰۱۶ ——— ۴۱۱۰۱۷

زر سالانہ بیس روپے - فی پرچہ -/۲ روپے

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

(۱)

سرزمین نجد و حجاز سے یوں بھی ہمیں بے پایاں محبت ہے کہ اسی ریگ زار سے ایمان و عرفان کا وہ چشمۂ مقدس اُبلا جس کے فیضان نے تمدّن کی بنجر کھیتیوں کو لالہ زار بنا دیا۔ فلاحِ انسانیت کی عظیم الشان تحریک محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی امامت و قیادت میں یہیں نمودار ہوئی۔ اس تحریک کے نور کو دنیا کی جس قوم نے بھی اخذ کیا، اس کے افراد اپنے علم، اپنے اخلاق اور اپنے کارناموں کی وجہ سے آسمانِ تاریخ کے مہ و انجم بن گئے اور جن مللِ خانماں خراب نے اس سے رُوگردانی کی، وہ عجائب خانۂ عبرت کی زینت بن گئیں۔

مزید یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ سعودی عرب کے موجودہ حکمران اور وہاں کے باشندے پاکستان سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ جب سے پاکستان بنا ہے وہ ہمیں محبت بھری نگاہ اُمید سے دیکھ رہے ہیں کہ ہم تحریکِ پاکستان سے لے کر اب تک کے اعلانات کے بموجب نظامِ اسلامی کا احیاء کرنے والے ہیں جس کے نتیجے میں پاکستان پورے عالمِ اسلام کے لیے ایمانی اور مادّی ہر دو لحاظ سے قلعہ بن جائے گا۔ اور بار بار پیش آنے والی رکاوٹوں کے باوجود انشاء اللہ ایسا ضرور ہو گا۔

پاکستان کو جب کبھی کوئی مصیبت پیش آئی تو سعودی عرب کے عمائد، علماء اور عوام سبھی مضطرب ہو گئے، اور حرمین میں ہمیشہ بہ الحاح اس سرزمین کی سلامتی و عافیت کے لیے دعائیں مانگی جاتی رہیں جو اسلامی نظام کے لیے وقف ہو چکی ہے۔ مدینہ یونیورسٹی کا قیام ہو، رابطۂ عالمِ اسلامی کی تاسیس، یا حج کی انتظامی مجلس سب میں پاکستان کو نمایاں طور پر حصّہ دار بنایا گیا۔ آج تک دعوتِ دین، فقہ، سائنس اور ٹیکنالوجی، اقتصادیات، بلاسود بنک کاری، نظامِ تعلیم، مساجد وغیرہ کے متعلق جو کانفرنسیں بُلائی جاتی رہی ہیں ان میں ہمیشہ پاکستانی مندوبین کو دعوت نامے بھیج کر شریک کیا گیا ہے۔ دوسری طرف سعودی عرب سے

پاکستان میں سرکاری اداروں کے رجالِ خاص اور علماء کبھی کبھی منفرداً اور کبھی وفد کی صورت میں آتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ تحریک تضامنِ اسلامی کے نقیبِ اوّل خود شاہ فیصل نے اپنی شہادت سے کچھ ہی وقت پہلے پاکستان کا دورہ کیا۔ آج اسلام آباد میں عظیم جامعہ شاہ فیصل بن رہی ہے جو ہمیشہ شاہِ شہید کی محبتِ پاکستان کی یادگار کے طور پر ہمارے سامنے رہے گی۔ اس مسجد کے گراں بہا مصارف پاکستان کے اس مرحوم محسن نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔

ہمارے اس برادر ملک سعودی عرب سے محبت و خلوص کی سوغات لیے ابھی ابھی ایک وفد آیا تھا۔ اس وفد کے آنے سے دینی جذبات کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔

اس وفد کے سربراہ عزت مآب الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آلِ الشیخ تھے جو بیت اللہ شریف کے امام و خطیب ہیں اور امامِ حج کی حیثیت سے خطبۂ حج بھی دیتے ہیں۔ موصوف کی اقتداء میں دنیا بھر کے لاکھوں مسلمان نمازیں ادا کرتے ہیں اور آپ کے خطبہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ شیخ عزت مآب کا تعلق سعودی عرب کے اس ممتاز گھرانے سے ہے جس کے ہاتھوں سعودی عرب میں انقلاب برپا ہوا اور انگریزوں کی سازباز کے سارے جال توڑ کر آلِ سعود برسرِ اقتدار آئے۔ محترم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ کا خاندان آج بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے اور دعوتِ دین اور علمِ دین کے لحاظ سے اسی کو فوقیت حاصل ہے۔

وفد کے دوسرے رکن جناب الشیخ سعید الجندول تھے جو سعودی عرب کے محکمہ تعلیم میں خاص منصب رکھتے ہیں۔

وفد کے تیسرے رکن پروفیسر ڈاکٹر احمد توتونجی تھے جو جنرل ورلڈ اسمبلی مسلم یوتھ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب دینی علوم کے ساتھ جدید جہانِ افکار سے بھی واقف ہیں۔ آپ دنیا میں دورے کر کے مسلم نوجوانوں سے رابطہ پیدا کرتے ہیں۔ ان تک دعوتِ دین کا پیغام پہنچاتے ہیں اُن کو متحرک اور منظم کرتے ہیں، اُن سے خط و کتابت رکھتے ہیں، ان کی تنظیموں اور اداروں کو ہر قسم کی امداد بہم پہنچاتے ہیں اور اُن کو کانفرنسوں میں مدعو کرتے ہیں۔

وفد کا کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ ہر جگہ استقبالیے اور ضیافتیں

ہوئیں۔ مسجد نیو ٹاؤن کراچی، شاہی مسجد لاہور، جامعہ منصورہ میں امام کعبہ نے نمازوں کی امامت کی۔ لوگ ہجوم کر کے آئے اور عالم اسلام کی ایک قابل قدر شخصیت کے پیچھے نماز پڑھنے کا خصوصی ثواب حاصل کیا۔ خاص طور پر مسجد نیو ٹاؤن کراچی میں جمعہ کی نماز کے لیے اتنا ہجوم تھا کہ مسجد کے تمام حصے، اس کی چھت، آس پاس کی سڑکیں اور گلیاں نمازیوں سے بھر گئیں۔ تقریبوں میں سپاسنامے پڑھے گئے یا خیر مقدم کے کلمات کہے گئے۔ اُن کے جواب میں جو تقریریں رئیس الوفد عزت مآب الشیخ عبد العزیز بن عبد اللہ امام حرم مکہ اور اُن کے معزز رفقا نے کیں۔ ان کا ماحصل یہ تھا کہ ہم نے مسلمانانِ پاکستان کے جذبۂ دینی کے متعلق جو کچھ پڑھا اور سُنا تھا، اس سے کہیں بڑھ کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ہم اس محبت و خلوص کے لیے بہت شکرگزار ہیں جس کے ساتھ جگہ جگہ ہمیں خوش آمدید کہا گیا۔ امام کعبہ کا ارشاد تھا کہ اہلِ پاکستان اسلامی نظام کے قیام کے لیے جو جہاد کر رہے ہیں ہم دل و جان سے اس کے ساتھ ہیں۔ سعودی عرب کے بعد پاکستان ہمارا دوسرا وطن ہے۔

عزت مآب امام کعبہ نے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی سے ملاقات کی۔ اس موقع پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ آپ نے چالیس سال تک جو کام کیا ہے اب اس کے برگ و بار نمودار ہو رہے ہیں۔ پورے قرآن کی تلاوت کا کیسٹ ٹیپ سیٹ موصوف نے ہدیہ کیا۔ امام صاحب نے مولانا کو یاد دلایا کہ جب آپ سفر ارض القرآن کے لیے تشریف لے گئے تھے تو ملاقات ہوئی تھی۔

یہ وفد اس تقریب کی شرکت سے بہت ہی خوش ہو کر لوٹا جو پنجاب یونیورسٹی یونین نے یونیورسٹی کے نیو کیمپس میں منعقد کی تھی۔ نوجوانوں کا ہجوم اور ان کا جوش و خروش دیکھ کر انہیں بخوبی یہ اندازہ ہو گیا کہ پاکستان کی نئی نسل جو تعلیم گاہوں میں تیار ہو رہی ہے وہ تحریک اسلامی کے علمبرداروں کی اکثریت پر مشتمل ہے۔ اس کا بار بار انہوں نے مختلف مواقع پر اظہار کیا۔

یاد رہے کہ یہ دورہ نہ تو حکومت پاکستان کی دعوت پر تھا، اور نہ اس کے لیے سابق حکومت کی طرح اسکولوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو جمع کرنے کے انتظامات کیے گئے تھے، نہ سرکاری ملازمین اور سفید کپڑوں میں خاص سروسز کے افراد کو حاضرین بنا کے لایا گیا، اور نہ پارٹی کے انتظام سے بیگار میں پکڑے ہوئے ٹرکوں اور بسوں میں لاد لاد کر دیہاتیوں کو اکٹھا کیا گیا۔

اندریں حالات وفد کا جو والہانہ استقبال ہوا اور جو محبت آمیز مجالس اور تقریبات اور دعوتیں منعقد ہوئیں

ان کی رُوح صرف خلوص تھا - اور جو کچھ ہوا وہ کم نہیں تھا -

یہ دَورہ وفد نے اپنے پروگرام کے تحت خود کیا تھا، جس کی منزلِ اوّل پاکستان تھا - اس کے بعد انہیں دنیا کے مختلف حصّوں میں جانا ہے اور ہر جگہ دین کا پیغام پہنچانا ہے، ہر جگہ مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لینا ہے، اور ہر جگہ اسلامی تنظیموں سے خصوصی رابطہ پیدا کرنا ہے - سعودی عرب کی یہ خدمت بہت قابلِ قدر ہے کہ اس کے عمائد اور علماء اور اس کے بعض ادارے دنیا بھر میں دعوت اسلامی اور تحریک اسلامی کی پشت پناہی کرتے ہیں - خود پہنچ پہنچ کر کام کرنے والوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں، عالمِ اسلامی میں جذبۂ اتحاد کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں -

اب جبکہ یہ مبارک وفد پاکستان سے بھارت جا چکا ہے تاکہ وہاں کے مسلمانوں کے احوال کو دیکھے سمجھے، اور پھر آگے دوسرے ملکوں میں جائے گا - ہم دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس وفد کو اپنے مبارک مقاصد میں کامیاب کرے اور سفر کو آسان بنائے -

---

(۲)

اقبال کے سالِ پیدائش[۱] سے ٹھیک ایک صدی بعد "سالِ اقبال" منایا گیا -

پہلے تو نہیں، مگر اس سال یہ سوال بڑی اہمیت سے میرے ذہن میں اُبھرا کہ اقبال کو جو وسیع محبوبیت و مقبولیت حاصل ہوتی ہے اس کا راز کیا ہے - اپنے ملک یا اپنی قوم میں کسی کا چرچا ہو جانا بھی بڑی بات ہے، مگر یہاں تو صورت معاملہ یہ ہے کہ شروع ہی سے اقبال پر دانشورانِ مغرب نے توجہ دی اور یہ توجہ اب تک مسلسل بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے - پھر مسلم ممالک اور اشتراکی ممالک سبھی میں اقبال کے فکر و فن پر کام ہو رہا ہے - ایسا بھی نہیں کہ اقبال کے محض دَورِ حیات میں اس کے اعلیٰ اور وسیع روابط کی بنا پر کچھ حلقوں میں دلچسپی رہتی اور پھر وہ آہستہ آہستہ غائب یا کم ہو جاتی - پھر اقبال نے نہ تو بطور خود اس کی تحریک کی کہ کچھ لوگ اس کے نام اور کام اور پیغام کو اچھالنے والے ہوں اور نہ اقبال

---

[۱] علامہ مرحوم کی تاریخ پیدائش سے متعلق جو بحثیں میری نظر سے گذری ہیں - ان کی بنا پر مجھے اطمینان نہیں ہے کہ علامہ ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے تھے - لیکن اس بات کو "غلط العام" بلکہ حقیقت میں غلط نحو اصی" کی حیثیت سے سب کے ساتھ مجھے "برداشت" کرنا پڑا ہے - (ن - س) -

کی زندگی میں سرکاری سطح پر اور نہ پاکستان بننے کے بعد اعلیٰ قومی سطح پر کوئی ایسا موثر اہتمام ہوا کہ اس شخصیت کا بھرپور گوشے گوشے میں اُڑایا جائے۔ کوئی پروپیگنڈہ مشینری بھی نہ تھی کہ مغربی اور مسلم ممالک کے جرائد میں کچھ لوگ اقبال کو موضوع بنا کر اشاعتی مہم جاری رکھتے۔ قوم نے اقبال کو اس رسمی انداز میں بھی نہیں لیا جسے ہیرو شپ یا اکابر پرستی کہتے ہیں۔ اس طرح کسی مصنوعی تدبیر کے بغیر ایک شخص کو دنیا بھر سے محبت و احترام کا خراج ملتا ہے۔

شعرا پہلے بھی اچھے سے اچھے ہو گزرے اور اب بھی موجود ہیں، جن سے دُنیا بھر میں استفادہ کیا جاتا ہے۔ عظیم درجے کے فلسفی بھی ہو گزرے ہیں اور آج بھی یکے بعد دیگرے نمودار ہو رہے ہیں، پیغام رکھنے والے مصلحین بھی ہر قوم میں اُبھرے، اور اب بھی سامنے آتے ہیں۔ مگر کسی شاعر، کسی فلسفی اور کسی مصلح کو یہ مقام نہ ملا کہ جگہ جگہ نہ صرف اسے پڑھا سمجھا جا رہا ہو، بلکہ اُس کے لیے ایک والہانہ جذبۂ محبت و احترام بھی موجود ہو۔

اس حیرت انگیز اور پراسرار حقیقت کو سمجھنے کے لیے میں نے جو تجزیہ کیا ہے، اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱- علامہ مرحوم کا ایک گراں بہا کارنامہ یہ ہے کہ مغربی لٹریچر اور مغربی فلسفہ اور مغرب کے پولیٹیکل اور سوشل ڈھانچے کا بھرپور عمیق مطالعہ خود مغرب کی سحر آگیں فضا میں رہ کر کرنے کے بعد وہ تہذیب نو کے سرابوں میں ڈوبا نہیں رہ گیا جن میں غوطہ لگانے والے اہل سیاست، اہل قانون اور اہل ادب و صحافت دوبارہ اُبھر نہ سکے، بلکہ اقبال پہلا ممتاز مفکر ہے جو ان سرابوں کی طلسماتی موجوں کے داموں کو توڑ کر نہ صرف زندہ و سلامت نکل آیا بلکہ اس کی سوئی ہوئی مسلمانیت بیدار ہو گئی۔ اور وہ دنیا کے سامنے تہذیب مغرب کے خلاف اپنا چارج شیٹ لے کر کھڑا ہو گیا۔

اقبال نے دَورِ حاضر سے فائدہ بھی اُٹھایا، ابتدا میں قدرے مرعوب بھی ہوا، مگر اس کا اصل کردار یہی ہے کہ اُس نے دَورِ حاضر کے تہذیبی فساد کو نمایاں کیا، اس کے کمزور پہلوؤں پر شدید گرفت کی اور اس کے تضادات کو عالم آشکارا کیا۔

اہم ترین نکتہ یہ تھا کہ اُس نے مادیت کی چکی میں پستے ہوئے انسان کی مظلومی کو سمجھا اور اس سے دل کی گہرائیوں سے ہمدردی کی۔ اُس نے نسل و وطن کی تفریقوں اور طبقاتی تقسیموں کو بے نقاب کیا اور بادشاہت، آمریت اور جمہوریت کی اذیت ناکیوں کا نوحہ گایا۔ اُس نے دولت، عورت، محنت، جنگ اور صلح کے مسائل چھیڑے۔ اس نے انسان کی اخلاقی اور روحانی ضرورتوں کے راگ الاپے۔

۲- علامہ نے فلسفہ پڑھا اور اس میں محض ایک امتحان پاس کرنے والے طالب علم کی سی دلچسپی نہ لی بلکہ ذاتی دلچسپی کے تحت نصابیات کے دائرے سے باہر نکل کر انسانی فکر و قیاس کے سمندر کو کھنگالا۔ اور جب وہ اس سمندر سے

باہر نکلا تو خود ایک سمندر تھا۔ مغربی فلسفے کے لیے اس کے اندر اگر کوئی مرعوبیت تھی بھی تو چند ہی غواصیوں کے بعد ختم ہوگئی۔ اور وہ اس فلسفے کے خلاف ہمہ تن ایک صدائے احتجاج بن گیا۔ مگر یوں نہیں کہ مغربی فلسفے سے محض بیزاری یا اختلاف کا اظہار کر دیا ہو، بلکہ ازسرِنو ایک فلسفے کی بنیاد رکھی اور مروجہ فلسفے کے اکابر و اساطین کے حوالوں سے بات اٹھائی۔ سائنس کی جدید ترین دریافتوں کو سامنے رکھا اور اپنے ایمان کی روشنی میں فکر و قیاس کی وہ نئی راہیں کھولیں جن پر چل کر خدا، وحی، نبوت، رسالت، ختمِ نبوت، حشر و نشر جیسے حقائقِ غیبیہ اس طرح سامنے آتے ہیں کہ عقل سرِ انقیاد جھکا دیتی ہے۔ سائنس، فلسفے اور ایمان کا جو امتزاج تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ میں پایا جاتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہرچند کہ یہ کتاب اقبال کے دورِ مابعد یا دورِ تکمیل کی آئینہ دار نہیں ہے اور اس میں پیش کردہ بہت سے افکار سے خود اقبال نے اختلاف کیا ہے، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے میدان میں اپنے طرز کی واحد کتاب ہے، اور شاید اب تک جدید مسلم فلسفیوں میں سے کسی نے قدم آگے نہیں بڑھایا۔ ہمارے یہاں تاثر یہ تھا کہ فلسفہ پڑھنے والے لوگ ملحد ہو جاتے ہیں۔ یہ قدرے صحیح بھی تھا، کیونکہ جدید فلسفہ تمام تر ملحدانہ مادیت کے مرکزی نقطے کے گرد مرتب ہوا تھا۔ اقبال نے ملحدانہ فلسفے کے متوازی خدا پرستانہ فلسفے کی راہ نکالی۔ اقبال کا یہ کام متکلمین اسلام سے بھی مختلف ہے۔ کیونکہ وہ فلسفہ تو تشکیل نہیں کرتے تھے۔ اور عیسائی فلسفیوں سے بھی مختلف ہے۔ کیونکہ وہ فلسفے کے نام سے بالعموم متکلمینِ عیسائیت کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور ان کے سامنے مذہبی مواد بڑا محدود تھا اور پرواز کے لیے فضا تنگ تھی۔

اس کتاب[1] میں اقبال کی اہم ترین بحث زمان (اور مکان) کی بحث ہے۔ وہ اپنا فلسفہ زمان مرتب کرنے کے لیے عرصہ دراز تک پڑھتے رہے۔ قدیم علما کی کتابوں میں مواد تلاش کرتے رہے، معاصر اہلِ علم سے مشورہ کرتے رہے۔ پھر جب پوری تیاری کے ساتھ مسئلہ چھیڑا تو اس شان سے کہ زمان کی تلوار سے مادیت کی جڑ کاٹ دی۔ یہ کتاب سیکولرازم کے خلاف گویا ایک اعلانِ جنگ ہے۔

اقبال کے اس کام نے اہلِ مغرب کو حیران کر دیا۔ یوں بھی ہمارے معاشرے کے گنبدِ افکار سے اہلِ مغرب کو

---

[1] دوسری طرف اقبال کا متوازی کام بہ عنوان مثنوی اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی، اسلام کے اساسیات کو ترتیب اور جامعیت سے پیش کرتا ہے۔ اس کے اندازِ بیان سے بھی فلسفہ جھلکتا ہے۔ یہ مثنوی بھی اہلِ مغرب کی توجہات کو کھینچنے میں کامیاب ہوئی۔ اس سے انھیں اسلام کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اپنی ہی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی اور نظام کا تمام جدید تعلیم یافتہ طبقہ سازِ محکومی سے تقلید کے راگ چھیڑ رہا تھا۔ ایسے میں اقبال کا آزادانہ نغمۂ تنقید و تجدید ان کے لیے جاذبِ توجہ ہوا۔ نقالوں اور خوشامدیوں اور مقلدوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے نواب کبھی کبھی آزاد مردوں کی آواز کو ترس جاتے ہیں۔ قدر ہمیشہ زندہ ضمیر اور بیدار دل لوگوں کی ہوتی ہے۔

۳۔ نوعِ انسانی کے دردناک مسائل ــــ جنگ و تصادم، بھوک، مزدوروں سے بے انصافی، قوموں کی غلامی، استعماری قوتوں کی لوٹ کھسوٹ، بیماریوں کا فروغ، جہالت کی عمومیت، نسل و وطن کی کھینچا تانیاں، اور خاندان کی تباہی، عورتوں کا ناجائز استعمال، جدید معاشرت کی گندگیاں۔ ان سب کو ذہن میں رکھتے ہوئے اقبال نے مسلسل سوچا کہ راہ نجات کیا ہے۔ پھر بغیر کسی اندھے تعصب کے تمام جدید نظریوں اور نظاموں کی جانچ پرکھ کے بعد اسلام پر انگلی رکھ دی کہ صرف یہی ایک نظام فلاحِ انسانیت کا ضامن ہو سکتا ہے۔

پھر بغیر کسی خوف کے اپنی مؤثر و دلنشیں شاعری میں اسلامی عقاید، احکام، عبادات، اخلاقیات اور سیاسی، معاشی اور تمدنی مسائل کو سمو دیا۔ شاعری کے لیے مقصد کو لازمی قرار دیا، مگر مقصد کو شاعری کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کیا کہ کہیں لذتِ سخن مجروح نہ ہونے پائی بلکہ ایک نئے طرز کا شکوہِ سخن پیدا ہو گیا۔ بات کہنے کے ایسے ایسے اسلوب ایجاد کیے کہ غور کرنے پر آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ مثلاً وہ کسی واعظ یا فقیہ کی طرح نماز پڑھنے کا وعظ نہیں کہتے بلکہ صرف اتنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ان مختصر الفاظ میں بڑا وسیع استدلال موجود ہے۔ یہ بات شعر کے پس منظر میں ہے کہ ذوقِ پرستش تو آدمی کی فطرت میں شامل ہے۔ اس ذوق کی تسکین اگر خدائے واحد کی عبادت سے نہ کی جائے تو پھر یہاں سیکڑوں خدا خراجِ عبادت لینے کے لیے نکل آئیں گے۔ توحید ان سب سے نجات پانے کا ذریعہ ہے۔

میں نے جا بجا بغور دیکھا ہے کہ الفاظ کے انتخاب اور ان کی ترتیب میں، نیز تراکیب اور تشبیہوں کے استعمال میں جو کمال اقبال کے ہاں ہے وہ کہیں نہیں ملتا۔ شعرِ اقبال میں عجب ساحرانہ اثر ہے۔ اقبال نے ادب برائے ادب یا فن برائے فن کا پورا قلعہ مسمار کر کے اپنا جھنڈا گاڑا ہے۔

پھر اس شخص کے پڑھنے کا انداز بھی وہ تھا کہ شاہی مسجد میں جس دن شہیدانِ طرابلس سے متعلق مسلمانوں کے اجتماع میں اپنی نظم سنائی، اس دن آخری شعر (مصرعہ: طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں) (باقی بر صفحہ ۴۱)

تعزیراتِ اسلام

(۴)

از جناب مولانا قاضی بشیر احمد صاحب

تیسری فصل - شرائطِ نفاذِ حد کے بیان میں

دفعہ ۱۴ | اگر دلائل شرعیہ سے سرقہ ثابت ہو جائے تو حد نافذ ہوگی۔ بشرطیکہ مندرجہ ذیل شرائطِ تنفیذِ حد پائی جائیں۔ اگر حد کے اجرا تک ان میں سے کوئی شرط فوت ہو جائے تو حد ساقط ہوگی اور تعزیری سزا عائد ہوگی۔[1]

<u>پہلی شرط۔</u> اجرائے حد تک سارق اور مسروق منہ کے درمیان خصومت قائم ہو[2]۔ اگر مسروق منہ مالِ مسروقہ کا مالک سارق کو بنا دے[3]، یا مندرجہ ذیل امور میں سے کسی ایک کا بھی قاضی کے سامنے اظہار کر دے تو خصومت باطل متصور ہوگی۔[4]

ا۔ میں نے یہ مال، سارق کے پاس بطور امانت رکھا تھا۔

ب۔ میرے گواہوں نے جھوٹ بولا ہے۔

ج۔ سارق کا اقرار جھوٹا ہے۔

د۔ مسروقہ مال، سارق یا عام مسلمانوں پر وقف ہے۔

تشریح ۱۔ خصومت کا اظہار مسروق منہ کے مطالبۂ مال پر ہوگا[5]۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اقرار کی

---

[1] رد محتار ص ۲۱۶ ج ۳

[2] المبسوط للسرخسی ص ۱۸۶ ج ۹ مطبوعہ مصر۔

[3] عالمگیری ص ۱۹۰ ج ۲

[4] المبسوط ص ۱۸۶ ج ۹ نیز عالمگیری ص ۱۸۳ ج ۲۔

[5] در مختار ص ۲۱۴ ج ۳

صورت میں مال کا مطالبہ کرنا ضروری نہیں ہے۔ جب کہ امام ابو حنیفہؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک ضروری ہے۔[1]

جمہور کی دلیل حضرت سمرہؓ کا واقعہ ہے۔ اس واقعہ میں مذکور ہے کہ "جب حضرت سمرہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اونٹ چرانے کا اقرار کیا تو آپ نے اونٹ والوں سے تحقیق فرمائی۔ انہوں نے کہا کہ واقعی فلاں رات کو ہمارا اونٹ گم ہوگیا تھا۔ اس پر آپ نے مُقِر پر قطع کا حکم نافذ فرمایا۔[2]

اس روایت سے معلوم ہوا کہ محض اقرار موجب قطع نہیں ہے۔ ورنہ اونٹ والوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تحقیق نہ فرماتے۔

نمبر ۲: اگر مسروق منہ سارق کو مال مسروقہ ہبہ کرے یا اس کے ہاتھ فروخت کرکے خصومت کو ختم کرنا چاہے تو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ مال سارق کے قبضہ میں بھی داخل ہوجائے، ورنہ خصومت قائم رہے گی اور قطع کا حکم ساقط نہ ہوگا۔[3] یہ مسلک امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ اور امام محمدؒ کا ہے۔

امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک قطع کے فیصلے کے بعد ہبہ کرنا قطع کو ساقط نہیں کرتا۔[4]
یہ حضرات صفوان بن امیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں۔

ان کا واقعہ یہ تھا کہ "ایک دن وہ مسجد میں اپنی چادر کا تکیہ بنا کر سو گئے۔ ایک چور اُن کی چادر لے کر چلا تو انہوں نے چور کو پکڑ لیا۔ اور اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آئے۔ آپ نے ثبوت کے بعد قطع ید کا حکم فرمایا۔ حضرت صفوان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یارسول اللہ! میرا یہ ارادہ نہیں تھا کہ اس کا ہاتھ کاٹا جائے۔ یہ چادر اس پر صدقہ ہے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میرے پاس لانے سے پہلے ہی ایسا کیوں نہ کیا؟"[5]

یہ حضرات فرماتے ہیں کہ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ہبہ قطع کو ساقط نہیں کرتا ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] در مختار ص ۲۱۴ ج ۳

[2] شرح معانی الآثار والمغنی ص ۲۹۱ ج ۱۰ مطبوعہ المکتبۃ السلفیۃ بالمدینۃ المنورۃ۔

[3] فتح القدیر بحوالہ عالمگیری ص ۱۷۹ ج ۲ [4] المبسوط ص ۱۸۶ ج ۹

[5] مؤطا امام محمدؒ۔

یہ ارشاد نہ فرماتے کہ "میرے پاس لانے سے قبل آپ نے ایسا کیوں نہ کیا"۔ بلکہ ایک روایت میں صراحۃً "فقطعہ" کا لفظ بھی آتا ہے۔ اس سے اور واضح ہوجاتا ہے کہ ہبہ قطع کو ساقط نہیں کرتا[۱]۔

لیکن اس واقعہ سے امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے مسلک پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ:

ا۔ اس حدیث میں اضطراب ہے اور اضطراب ضعف پیدا کرتا ہے جو قابلِ حجت نہیں۔ ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی کے اندر یہ روایت تو اسی طرح ہے مگر مستدرک میں روایت کے الفاظ مختلف آئے ہیں جس سے اس کے اندر اضطراب ثابت ہوتا ہے۔

ب۔ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت صفوانؓ نے چادر ہبہ کرنے کے بعد اس کو سارق کے قبضہ میں نہ دیا ہو۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قطع کا حکم ساقط نہیں فرمایا[۲]۔

ج۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد یعنی "آپ نے میرے پاس اس کو لانے سے قبل ایسا کیوں نہ کیا" کا یہ مطلب سمجھنا کہ اب حد ساقط نہ ہوگی صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ جب آپ کو سارق سے ہمدردی بھی ہے تو اگر میرے پاس مقدمہ نہ لاتے تو بہتر تھا۔ اس لیے کہ اس کا پردہ فاش نہ ہوتا۔ چنانچہ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جب حضرت صفوان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چادر کا مقدمہ پیش کیا تو آپؐ کا چہرۂ انور متغیر ہوگیا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے عرض کیا کہ "اے اللہ کے رسولؐ! معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکایت آپ پر ناگوار گزری ہے" تو آپ نے فرمایا مجھ پر ناگوار کس طرح نہ گذرتی جب کہ تم اپنے مسلمان بھائی کے خلاف شیطانوں کے مددگار کی طرح ہو[۳]۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر ملزم کی پردہ دری ناگوار گزری ہے۔ اس لیے کہ جب حضرت صفوانؓ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کا ہاتھ قطع کیا جائے تو پھر اُن کو واقعہ پردہ میں رکھنا چاہیے تھا اور محض شکایت سے انسدادِ جرم کرنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔

دوسری شرط:۔ مالِ مسروقہ سارق نے خصومت سے قبل واپس نہ کیا ہو[۴]۔

---

[۱] المبسوط۔

[۲] مرقات شرح مشکوٰۃ ص ۱۶۱-۱۶۲ ج ۷ مکتبہ ملتان۔

[۳] المبسوط ص ۱۱۸ ج ۹۔ [۴] درمختار ص ۲۱۶ ج ۳۔

تیسری شرط۔ سرقہ بھوک سے بیقرار ہو کر نہ کیا ہو[۱]۔

چوتھی شرط۔ سارق کا بایاں ہاتھ یا اس کا انگوٹھا یا انگوٹھے کے علاوہ اس کی دو انگلیاں یا داہنا پاؤں کٹا ہوا یا ناکارہ نہ ہو[۲]۔ اگر داہنے پاؤں کی کچھ انگلیاں کٹی ہوئی ہوں مگر اس کے باوجود وہ چل سکتا ہو تو یہ ناکارہ شمار نہ ہوگا[۳]۔

ان شرائط کے اندر مندرجہ ذیل تشریحات کا اعتبار کیا جائے گا۔

تشریح ۱: "خصومت سے قبل" سے مراد عدالت مجاز میں مقدمہ دائر کرنے سے پہلے ہے[۴]۔ اور مال مسروقہ کی واپسی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مسروق منہ کے ہاتھ میں پکڑائے بلکہ اس کے اصول و فروع یعنی باپ دادا وغیرہ یا بیٹا، پوتا وغیرہ اور اس کے علاوہ اس کے دیگر قریبی رشتہ دار کے ذریعہ بھی مال کی واپسی معتبر ہوگی[۵]۔

تشریح ۲: بھوک سے بیقرار ہو کر اگر سارق نے مال چرایا ہو تو اس پر قطع کا حکم عاید نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ حرام مال کو ایسی صورت میں بقدر دفع حاجت استعمال کی گنجائش ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "لا قطع فی مجاعة مضطر" یعنی بے قرار کرنے والی بھوک کی صورت میں قطع نہیں ہے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ قحط کے سال میں قطع کی سزا نہیں ہے[۶]۔

تشریح ۳: اگر سارق کا بایاں ہاتھ یا اس کا انگوٹھا یا انگوٹھے کے علاوہ دو انگلیاں یا داہنا پاؤں ناکارہ یا کٹا ہوا ہو تو ایسی صورت میں اس کو قید کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ توبہ کرے یا مر جائے[۷]۔ داہنا ہاتھ ناکارہ ہو یا اس کی انگلیاں کٹی ہوئی ہوں تو اس کے باوجود اس کو قطع کیا جائے گا ظاہر الروایہ

---

۱ البحر ص ۵۴ ج ۵۔

۲ ہدایہ ص ۵۴۸ ج ۲ - شامی ص ۲۱۳ ج ۳ - غایۃ الاوطار ص ۴۵۸ ج ۲۔

۳ رد المحتار ص ۲۱۳ ج ۳۔ ۴ شامی ص ۲۱۶ ج ۳ ۵ ایضاً

۶ مرقات شرح مشکوٰۃ ص ۱۵۸ ج ۷ مطبوعہ مکتبہ ملتان والبحر ص ۵۴ ج ۵

۷ ہدایہ ج ۲ ص ۵۴۸ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی و رد المحتار ص ۲۱۳ ج ۳ وغایۃ الاوطار ص ۴۵۸ ج ۲۔

میں ہے کہ اگر مطلوبہ عضو ناکارہ یا ناقص ہو گیا ہو تو اس کے باوجود اس کو قطع کیا جائے گا[۱] خواہ اس کی سب انگلیاں کٹی ہوئی ہوں یا بعض[۲]

پانچویں شرط ۔ مال مسروقہ میں سارق کے حصہ کا شبہ نہ ہو[۳] اور حرم کے اندر غیر مکلف اور ذی رحم محرم رشتہ دار شریک نہ ہوں ۔

تشریح ۔ پیچھے نصاب کے بیان میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حد کو ٹالنے کی جو حدیث گذر چکی ہے اس کی رو سے یہ ضروری ہے کہ اگر مال مسروقہ کے اندر سارق کا حصہ ہو تو حد سے نکلنے کا یہ راستہ ہے اس لیے حد نافذ نہ ہو گی ۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام شبہ کے ہوتے ہوئے حد کو جاری نہ فرماتے تھے ۔ چنانچہ :۔

۱۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے مال غنیمت سے چوری کی تھی تو آپ نے یہ فرماتے ہوئے اس پہ حد سرقہ جاری نہیں کی کہ اس میں اس کا حصہ بھی ہے[۴]۔

۲۔ کوفہ کے اندر ایک شخص نے بیت المال سے چوری کی تو اس کے متعلق ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف رجوع کیا ۔ آپ نے ان کو جواب میں تحریر فرمایا کہ "آپ اس شخص پر قطع کا حکم نافذ نہ کریں اس لیے کہ بیت المال میں اس کا بھی حصہ ہے[۵]"

اگر کوئی شخص اپنی اولاد کا مال لے جائے تو اس پر قطع نہیں ہے ۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ یہاں بھی شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اولاد کی کمائی میں والد کا حصہ بھی ہے ۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے ۔ " انت ومالك لابيك" یعنی "تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لیے ہے"۔ دوسری روایت میں اس طرح آیا ہے ۔ ان اطيب ما اكل الرجل من كسبه وان ولده من كسبه ۔ یعنی "آدمی کا سب سے زیادہ پاکیزہ مال وہ ہے جو اس کی کمائی کا ہو اور اس کا بیٹا بھی اس کی کمائی سے ہے[۶]۔" اسی طرح بیٹا اگر باپ دادا کا مال چرا لے تو

۱؎ رد المحتار ص ۲۱۳ ج ۳ — ۲؎ المغنی ص ۲۶۹ ج ۱۰

۳؎ در مختار ص ۲۰۰ ج ۳ — ۴؎ مصنف عبد الرزاق ص ۲۱۲ ج ۱۰

۵؎ مصنف عبد الرزاق ص ۲۱۲ ج ۱۰ ۔ مطبوعہ مجلس علمی کراچی ۔

۶؎ المغنی ص ۲۷۶ ج ۱۰ ۔

قطع کا حکم عائد نہ ہوگا۔[۱]

اِن روایات سے معلوم ہوا کہ اگر یہ شبہ پیدا ہو جائے کہ مالِ مسروقہ کے اندر سارق کا بھی حصہ ہے تو حد نافذ نہ ہوگی۔

چھٹی شرط۔ اجرائے حد کے وقت تک نصاب سرقہ میں کمی واقع نہ ہو۔[۲]

تشریح ۱: جس شہر میں حد سرقہ جاری کی جارہی ہو وہاں نصاب سرقہ شروع سے لے کر حد کے اجراء تک پورا ہونا ضروری ہے۔ اگر اس دوران میں مالِ مسروقہ کی قیمت میں کمی واقع ہو جائے تو امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک دیکھا جائے گا کہ اگر یہ کمی مسروق کی ذات کے گھٹ جانے یا اس میں کوئی عیب پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہوئی ہو تو حد ساقط نہ ہوگی اور اگر یہ کمی بھاؤ کے گرنے کی وجہ سے ہوئی ہو تو حد ساقط ہوگی۔[۳]

تشریح ۲: اگر سرقہ بمقدار نصاب ایک شہر میں کیا گیا ہو اور سارق دوسرے شہر میں پکڑا گیا ہو جس میں مال مسروقہ کی قیمت نصابِ سرقہ سے کم ہو تو حد نافذ نہ ہوگی۔[۴]

چوتھی فصل - چوری کی سزا کے بیان میں

دفعہ ۱۵: چوری کی سزا مندرجہ ذیل تفصیل کے تحت نافذ کی جائے گی۔

۱۔ پہلی مرتبہ سرقہ کرنے پر سارق کا دایاں ہاتھ اور دوسری مرتبہ سرقہ کرنے پر اس کا بایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ اگر تیسری مرتبہ بھی وہ سرقہ کرے تو اب اس کو قطع کی سزا نہیں دی جائے گی بلکہ توبہ کرنے تک اس کو قید رکھا جائے گا۔[۵]

اگر حد کے اجراء سے قبل یا ایک حد کے اجراء کے بعد دوسری حد کے اجراء سے قبل سارق ایک سے

---

[۱] المغنی ص ۲۰۶ ج ۱۰ — [۴] ردالمحتار ص ۱۹۹ ج ۳

[۲] ردالمحتار ص ۱۹۹ ج ۳ — [۳] ردالمحتار ص ۱۹۹ ج ۳

[۵] ہدایۃ ص ۵۴۸ ج ۲ و ردالمحتار ص ۲۱۳ ج ۳

زائد چوریاں کرے تو حد سب کی جانب سے مذکورہ ترتیب پر ایک ہی ہوگی[1]

تمثیل:۔ زید نے ایک آدمی کی چوری کی مگر اس پر حد جاری نہ ہوئی تھی کہ اس نے پانچ چوریاں مزید کر دیں۔ اب پانچویں مرتبہ وہ پکڑا جاتا ہے تو حد ان سب کی ایک ہی ہوگی یعنی اس کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اسی طرح اس کے بعد پھر اگر وہ ایک یا ایک سے زائد سرقہ کرے تو حد ایک ہی ہوگی یعنی اس کا بایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔

ب۔ ہاتھ کو پہنچے کے جوڑ سے اور پاؤں کو ٹخنے سے کاٹا جائے گا۔[2]

ج۔ قطع کرنے کے بعد خون بہنے کو بند کیا جائے گا اور کٹے ہوئے ہاتھ کو اگر قاضی چاہے تو سارق کی گردن میں لٹکا دے گا۔

د۔ مجرم اگر بیمار ہو یا موسم زیادہ گرم یا زیادہ سرد ہو جس سے یہ خوف ہو کہ ایسی حالت میں اس کے عضو کو کاٹنے سے وہ فوت ہو جائے گا تو مناسب وقت تک سزا کو ملتوی کیا جائے گا اور مجرم کو قید رکھا جائے گا۔ اور عورت اگر حاملہ ہو تو اس کو بھی بیمار شمار کیا جائے گا۔[3]

ہ۔ جس سارق کا دایاں ہاتھ نالش سے قبل نہ ہو تو اس کا بایاں پاؤں کاٹا جائے گا اور اگر اس کا ہاتھ نالش کرنے کے بعد نہ رہا ہو خواہ کسی نے کاٹ دیا ہو یا آفت سماوی سے ختم ہو گیا ہو تو قطع کا حکم ساقط ہو جائے گا۔[4]

تشریحات حسب ترتیبِ مذکورہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

تشریح ۱۔ تیسری اور چوتھی مرتبہ سرقہ کرنے کی سزا کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں تیسری بار اس کا بایاں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اور چوتھی مرتبہ اس کا دایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مروی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب چور چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ اگر دوبارہ

---

[1] ردالمحتار ص ۲۱۷ ج ۳

[2] احکام القرآن للجصاص ص ۴۲۰، ۴۲۱ ج ۲ و المغنی ص ۲۶۶ ج ۱۰

[3] المبسوط ص ۱۶۸ ج ۹ و درمختار ص ۲۱۲ ج ۳ [4] ردالمحتار ص ۲۱۴ ج ۳ و المغنی ص ۲۶۸ ج ۱۰

کرے تو اس کا پاؤں کاٹ دو۔ اور اگر تیسری مرتبہ کرے تو اُس کا ہاتھ کاٹ دو۔ اور اگر چوتھی مرتبہ کرے تو اُس کا پاؤں کاٹ دو"[۱]

امام ابوحنیفہ رح دوسری مرتبہ کے قطع کے بعد قطع کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اجماع کو اور اُن کے عمل کو اپنے مسلک کی بنیاد بناتے ہیں[۲]۔

امام محمد بن الحسن رحمۃ اللہ کتاب الآثار میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا "جب چور چوری کرے تو اس کا داہنا ہاتھ کاٹا جائے گا اور جب دوبارہ کرے تو اُس کا بایاں پاؤں کاٹا جائے گا اور اگر تیسری بار چوری کرے تو اس کو قید کیا جائے گا یہاں تک کہ اس سے نیکی کے آثار ظاہر ہوجائیں۔ دوسری بار کے قطع کے بعد مجھے اللہ تعالیٰ سے شرم آتی ہے کہ میں اس کے لیے کوئی ہاتھ نہ چھوڑوں جس سے وہ کھانا کھائے اور استنجا کرے۔ اور کوئی پاؤں نہ چھوڑوں جس پر کہ وہ چلے"[۳]

ایک شخص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سارق کے بارے میں خط لکھا تو انہوں نے وہی جواب دیا جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیا[۴]۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سارق کے بارے میں صحابہ کرام سے مشورہ کیا تو سب نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول پر اجماع کیا[۵]۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک چور لایا گیا جس کا ایک ہاتھ اور بایاں پاؤں پہلے سے سرقہ میں کاٹا ہوا تھا تو آپ نے اس کو قید میں بھیج دیا اور مزید کسی عضو کو نہیں کاٹا[۶]۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی اسماءؓ بنت عُمَیس کا ہار گم ہوگیا جس کو ایسے آدمی نے چرایا جس کا دایاں ہاتھ کٹا ہوا تھا۔ ہار بعد میں برآمد ہوگیا جس کا اعتراف بھی سارق نے کر لیا تو آپ نے اُس کا بایاں پاؤں کاٹ دیا۔ اس شخص کے بارے میں بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ اُس کا ایک

---

[۱] مرقاۃ المفاتیح ص ۱۶۴ ج ۷ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان۔

[۲] ہدایہ ص ۵۴۸ ج ۲ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی۔

[۳] مرقاۃ المفاتیح ص ۱۶۵ ۔ ج ۷ مکتبہ امدادیہ ملتان [۴] ایضاً [۵] ایضاً

[۶] ایضاً ص ۱۶۶ ج ۷ ۔

ہاتھ اور ایک پاؤں پہلے سے کٹا ہوا تھا۔ مگر امام محمدؒ نے فرمایا کہ ابن شہاب زہری اسی حدیث کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ اس روایت میں مذکور ہے کہ اس شخص کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں یعنی دونوں پہلے سے کٹے ہوئے تھے اور ابن شہاب اس قسم کی خبروں کو اپنے شہر والوں سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ اور یہیں حضرت عمرؓ بن الخطاب اور حضرت علیؓ بن ابی طالب کے متعلق معلوم ہوا کہ چور کے دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں سے زیادہ نہیں کاٹتے تھے۔[1]

علاوہ ازیں چاروں اعضاء کو قطع کرنا حد کے مقصد کے بھی خلاف ہے اس لیے کہ حد کا مقصد کسی جان کو تلف کرنا نہیں ہے بلکہ جرم سے روکنا ہے اور چاروں اعضاء کو قطع کرنے کی صورت میں وہ درحقیقت معنوی طور پر ہلاک ہو جاتا ہے۔[2]

امام شافعیؒ نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے یا اس کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات ہیں جن میں قتل تک کا بھی ذکر ہے۔ تو ان سب روایات کا تعلق حد سے نہیں ہے بلکہ تعزیری سزا سے ہے۔ اگر مجرم اتنا دلیر ہو جائے کہ معمولی یا کم درجہ کی سزا سے باز نہ آئے اور ملک میں فساد برپا کرتا پھرے تو ایسی صورت میں مصلحتِ عامہ کے پیش نظر حاکم مجاز کو اس طرح کی سزا دینے کا بھی اختیار ہے۔[3]

قطع کرنے کی ابتداء دائیں ہاتھ سے ہو گی

قطع میں پہلے کون سا ہاتھ ہو؟ اس مسئلہ میں آیت " السارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما" سے صراحت معلوم نہیں ہوتی۔ اس سے صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ کاٹ دو۔ مگر ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرأۃ میں "فاقطعوا ایمانھما" ہے۔ جس سے مسئلہ واضح ہو جاتا ہے کہ قطع کی ابتداء دائیں ہاتھ سے کی جائے گی۔ اس لیے کہ ایمان کا لفظ جمع ہے اور اس کا واحد یمین آتا ہے جس کے معنی دائیں ہاتھ کے ہیں۔[4]

لفظ ایمانھما کی قرأۃ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مذکورہ آیت میں ایدیھما سے ایک ہاتھ مرد کا مراد ہے اور ایک عورت کا۔ اس لیے کہ ایک شخص کے دونوں ہاتھ داہنے نہیں ہو سکتے اور لفظ " ایدیھما"

---

[1] موطا امام محمد مترجم اُردو ص ۳۱۲ [2] ہدایہ جلد ۲

[3] احکام القرآن للجصاص ص ۲۲۴ ج ۲ [4] ایضاً

ہیں "ایدی" کا لفظ اگرچہ جمع مذکور ہے مگر مراد تثنیہ ہے۔ اس لیے کہ عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر تثنیہ کی اضافت تثنیہ کی طرف ہو تو یہ ثقیل ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں مضاف کو جمع لا کر ثقل کو دور کیا جاتا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں " فقد صغت قلوبکما " میں لفظ قلوب کو جمع ذکر کیا گیا ہے اور مراد قلبا کما ہے اس لیے کہ دو آدمیوں میں دو دل ہوتے ہیں زیادہ نہیں ہوتے۔ اسی طرح اس آیت میں ایدیھما سے دو ہاتھ مراد ہیں[۳]۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ " اگر کوئی چوری کرے تو اس کا دایاں ہاتھ ہتھیلی کے جوڑ سے کاٹ دو "۔ اور صحابہ میں سے کسی نے بھی آپ سے اختلاف نہیں کیا۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ " اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر " یعنی میرے بعد خصوصاً ابو بکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کی اتباع کو لازم پکڑو۔ اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ قطع کی ابتدا داہنے ہاتھ سے کی جائے۔ عقلاً بھی پہلے دائیں ہاتھ کو کاٹنا ضروری ہے اس لیے کہ گرفت کی زیادہ قوت اسی ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس لیے سزا کی ابتداء بھی اسی ہاتھ سے کی جائے تاکہ جرم سے لوگوں کو ڈر زیادہ پیدا ہو جائے[۴]۔

ہاتھ کو کف کے جوڑ سے کاٹا جائے گا

نمبر ۲ اور شیخین کے ارشاد سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ہاتھ کو ہتھیلی کے جوڑ سے کاٹا جائے گا اس کی مزید توضیح عمرو بن شعیب کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ " آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک سارق لایا گیا تو آپ نے اس کا ہاتھ کف کے جوڑ سے کاٹا[۵]" اور کف سے مراد انگلیوں سمیت ہتھیلی ہے[۶] اور کاٹنے کی جگہ وہ جوڑ ہے جو ہتھیلی کو بازو کے ساتھ ملاتا ہے۔ اسی جوڑ کو ایک روایت میں لفظ " زند " سے بھی تعبیر کیا گیا ہے[۷]۔

قرآن وسنت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پہلے دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا اور کاٹنے کی جگہ بازو اور پہنچے کا جوڑ ہے۔ چنانچہ فقہاء اربعہ اور اہل ظاہر کا یہی مسلک ہے۔

اس مسئلہ میں شیعہ امامیہ کا جمہور سے اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہاتھ کو انگلیوں کی جڑوں سے کاٹا جائے گا۔ اسی طرح خوارج بھی ان دونوں سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہاتھ کو کاندھے سے کاٹا جائے گا۔ امامیہ کہتے

---

[۳] المبسوط ص ۱۶۰ ج ۹ مطبوعہ مصر [۴] المغنی والشرح الکبیر ص ۲۶۴ ج ۱۰ مطبوعہ مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ۔

[۵] سبل السلام علی متن بلوغ المرام لابن حجر العسقلانی ص ۲۷ ج ۴

[۶] منجد [۷] ہدایہ ص ۵۴۷ ج ۱

ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صرف ہاتھ کی انگلیاں حد سرقہ میں کاٹی تھیں اور خوارج کہتے ہیں کہ "ید" کا اطلاق کاندھے تک کے پورے حصّہ پر ہوتا ہے۔ لہٰذا محل قطع کاندھا ہے[1]۔

لیکن بات درحقیقت یہ ہے کہ "ید" کا اطلاق تین حصوں پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ کاندھے تک کے پورے حصّے کو ید کہا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ آیت "فامسحوا بوجوهكم وايديكم منه" کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ مسح کاندھے تک کیا جانا ضروری ہے۔ آپؓ کا یہ سمجھنا اس اعتبار سے تو صحیح تھا کہ لغت میں "ید" کا اطلاق کاندھے تک بھی ہوتا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کاندھے تک کا مسح کرنا ثابت نہیں ہے۔ دوسرا "ید" کا اطلاق ہتھیلی کے جوڑ تک کا حصّہ یعنی پہنچے کے لیے بھی ہوا ہے جیسا کہ ان آیات میں کیا گیا ہے۔ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا۔ اور اُدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ۔ اس لیے کہ جیب میں پہنچا ہی داخل ہو سکتا ہے کاندھے تک بازو کا دخول اور خروج ممکن نہیں۔ تیسرا کہنی تک کے حصّے کو بھی ید کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ آیت وضو میں "ايديكم الى المرافق" یعنی ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو۔

مذکورہ تینوں صورتوں میں سے کم از کم "ید" کا اطلاق جس حصّہ پہ ہوا ہے وہ کف ہے اور کف سے کم پر ید کا اطلاق نہیں ہے۔ اسی لیے "فامسحوا بوجوهكم وايديكم منه" (الآية) (یعنی تم اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کرو) میں کسی کے نزدیک بھی کف سے کم حصّہ پہ مسح یعنی تیمم کرنے پر اکتفا کرنا صحیح نہیں ہے۔ جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ کف سے کم حصّہ پہ ید کا اطلاق نہیں ہوتا اور ید کا کم از کم یقینی مصداق یہی ہے۔ اور آیت سرقہ میں قطع ید کا حکم تو موجود ہے مگر ید کا مصدوق واضح نہیں ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ قطع کرنے میں ید کا یقینی مصداق مراد لیا جائے اور وہ ہتھیلی ہی ہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور اس پہ شیخین کے ارشادات مذکورہ سے مسئلہ مزید صاف اور نکھر کر سامنے آگیا کہ قطع ید سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہاتھ کو انگلیوں کی جڑوں سے کاٹا جائے بلکہ پوری ہتھیلی کو جوڑ سے کاٹنا ہے[2]۔

اور شیعہ امامیہ کی دلیل انتہائی کمزور ہے اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایات میں اختلاف ہے،

---

[1] التشریع الجنائی الاسلامی ص ۶۲۸ ج ۲

[2] پوری بحث دیکھئے احکام القرآن للجصاص ص ۴۱۲-۴۲۰ ج ۲ مطبوعہ بیروت۔

چنانچہ آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ ہاتھ کو بیچ کی انگلی سے چھوٹی انگلی تک کاٹا جائے گا۔ علاوہ ازیں جس کی انگلیاں کاٹ لی جائیں اس کو لغتاً اور عرفاً "مَقْطُوعُ الاصابع" کہا جاتا ہے۔ مقطوع الید (ہاتھ کٹا) نہیں کہا جاتا۔ اور آیت میں انگلیاں قطع کرنے کا حکم نہیں ہے بلکہ ہاتھ قطع کرنے کا ہے[1]۔

پاؤں کو ٹخنے سے کاٹا جائے گا

ائمہ اربعہ کے نزدیک پاؤں کو بھی ٹخنے سے کاٹا جائے گا۔ جب کہ شیعہ امامیہ یہاں بھی اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پاؤں کو نصف قدم یعنی تسمہ باندھنے کی جگہ سے کاٹ دیا جائے گا۔ وہ دلیل میں کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نصف قدم سے پاؤں کاٹا تھا[2]۔

جمہور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فعل سے استدلال کرتے ہیں کہ آپ نے سارق کا پاؤں ٹخنے سے کاٹا تھا[3]۔

قطع کا طریقہ

قطع کرنے کے لیے آسان سے آسان طریقہ اختیار کیا جائے گا جس سے کہ مجرم کو کم سے کم تکلیف ہو۔ فقہاء نے ایک طریقہ یہ بیان کیا ہے کہ مجرم کو بٹھایا جائے اور اس کو مضبوطی سے پکڑا جائے تاکہ حرکت کرنے سے کہیں اس کو زیادہ نقصان نہ ہو جائے۔ پھر اس کے مطلوبہ عضو کو رسّی سے باندھ کر خوب کھینچا جائے تاکہ جوڑ خوب ظاہر ہو جائے۔ پھر اس جوڑ پر انتہائی تیز چھری یا کوئی اور تیز آلہ رکھ دیا جائے اس آلہ پر زور سے مارا جائے تاکہ ایک ہی دفعہ عضو کٹ جائے۔ اگر چھری ہو تو اس کو اتنی تیزی سے کھینچا جائے کہ ایک ہی رگڑ سے عضو الگ ہو جائے۔ پھر خون بند کرنے کے لیے عضو کو گرم تیل میں رکھا جائے یا کوئی اور مناسب دوا لگائی جائے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ "عضو کو کاٹ دو اور پھر اس کو داغ دو" تاکہ خون بند ہو جائے[4]۔

(باقی)

---

[1] سبل السلام علی متن بلوغ المرام لابن حجر العسقلانی ص ٢٧ ج ٤

[2] المغنی ص ٢٦٤ ج ١٠ [3] ایضاً [4] ایضاً

جامعہ خواتین کیوں اور کس طرح؟

(۲)

از جناب نعیم صدیقی صاحب

اسلام کا دیانتدارانہ اتباع یہ مقصد اتنا اہم اور بنیادی ہے کہ صحیح ترتیب کے لحاظ سے اسے سب سے پہلے لانا چاہیے تھا مگر بعض وجوہ سے ہم نے اس مثبت مقصد کو مؤخر رکھا ہے اور اب یہ جہاں بھی مذکور ہے اس کی اوّلیت و مقصدیت اس کے ساتھ ہے۔

سیدھی سی بات ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور تاریخی احوال سے گزرتے ہوئے ہم خواہ کیسی بھی فکری اور عملی کوتاہیوں میں جا پڑے ہوں آج بھی ہمارے لیے سرچشمۂ ہدایت اسلام ہے۔ دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ہر معاملہ میں اسلام کے مقرر کردہ اصول و حدود کو معیارِ فیصلہ قرار دیں اور سرسری معلومات کو لے کر تاویلاتی ہیر پھیر سے انحراف کی راہیں نکال لینے کے بجائے دینِ برحق کے تقاضوں کو بہترین مفہوم کے ساتھ عملی زندگی کا حصہ بنائیں۔ حتیٰ کہ صحیح مقامِ ایمان یہ ہے کہ بعض احکام و حدود اگر بظاہر ہماری طبائع کو (جو اضمحلال زدہ ہیں) خوش آئند نہ معلوم ہوں تو بھی انہیں سر آنکھوں پہ رکھیں۔

اسلام کے معاشرتی ضابطوں کا اگر ٹھنڈے دل اور گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ فلاحِ انسانیت کے اس نظام میں نسائیت کے مقامِ احترام، اس کے جوہرِ ناموس اور خواتین کے ذہن و کردار کی پاکیزگی کے تحفظ کا مکمل اور مؤثر انتظام کیا گیا ہے۔

اس تحفظ کے لیے قرآن و حدیث میں صریح و بدیہی طور پہ پردہ داری کے احکام دیے گئے ہیں۔ خواتین کے لیے غیر محرموں (محرموں کی فہرست مقرر کر دی گئی) کے سامنے نمائشِ زینت و آرائش کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ بات کرنے میں لوچ اور ناز و ادا کا طریقہ اختیار کرنے سے روکا گیا ہے۔ اور صنفین کے اختلاطِ عام

(FREE MIXING OF BOTH THE SEXES) کے راستے بند کیے گئے ہیں۔

قرآن میں جو آیات خواتین، پردے یا نظامِ معاشرت سے متعلق ہیں اُن کو کوئی بھی معقول آدمی سامنے رکھ کر خود دیکھ سکتا ہے کہ قانونی و اخلاقی احکام جس طرح بیان ہوئے ہیں اُن کے اگر کم سے کم تقاضوں کو بھی سامنے رکھا جائے تو مغربی تہذیب کی مخلوط معاشرت (اور مخلوط تعلیم) کو کسی طرح بھی حریم اسلام میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔

قرآنی احکام کی عملی تفسیر و تشریح کی حیثیت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ثابت شدہ اسوہ کو دیکھیے تو یہ حقائق سامنے آتے ہیں کہ حضورؐ نے عورتوں کے لیے تعلیم و وعظ کا الگ انتظام کیا۔ نمازوں میں ان کی صفیں الگ رکھیں، مسجد سے نکلنے کا راستہ الگ مقرر فرمایا۔ عیدین میں ان کی نشست کا علیحدہ بندوبست کیا۔ زندگی کی روزمرہ تقریبوں اور مجالس میں مخلوطیت کو سختی سے روکا۔ مردوں سے بیعت لینے کے طریقے کے بخلاف بیعت کرنے والی کسی عورت کے ہاتھ کو کبھی مس نہیں کیا۔ انہیں بیرونِ خانہ کی بھاری سرگرمیوں (مثلاً جہاد وغیرہ[1]) سے مستثنیٰ کر کے بشارت دی کہ وہ اپنی مخصوص نسوانی ذمہ داریوں کو حسن و خوبی سے ادا کرتے ہوئے ویسی ہی جزا پائیں گی جیسی مجاہدین اور شہداء کو ملتی ہے۔ انہیں سیاسی تگ و دو[2] سے الگ رہ کر گھروں کے دروبست کو سنبھالنے اور نئی نسلوں کی برداشت و پرداخت کرنے میں انہماک کا راستہ دکھایا۔ اور اقتصادی ترقی کے لیے گھریلو صنعت کی طرف توجہ دلائی۔

مقصد یہ تھا کہ بیرونِ خانہ کے ہنگامے جو کچھ بھی ہوں۔ تعمیرِ انسانیت کے ان بنیادی اداروں کا کام متاثر نہ ہو۔ جنہیں گھر اور خاندان کہا جاتا ہے۔ اور جن کا انچارج خواتین کو بنایا گیا ہے۔ اسلامی ریاست اور معاشرے کی وہ تمام انسانی قوت (MAN-POWER) جو قیادت کے مناصب کو سنبھالتی ہے، جو تعلیم اور انصاف کے

---

[1] اسماء بنت یزیدؓ خواتین کا ایک وفد لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اور سب کی طرف سے مردوں کی بیرونِ خانہ ذمہ داریوں کا ذکر کر کے عرض کیا ہم خواتین آخر کیوں ثواب کے لیے بڑے کاموں سے محروم رکھی گئی ہیں۔ حضورؐ نے وضاحت کی کہ تمہارے لیے گھریلو ذمہ داریوں پر ویسا ہی ثواب ہے۔ اور ایمان و اطاعت کا کمال یہ تھا کہ خواتین نے بے چون و چرا تسلیم کر لیا۔ الاستیعاب لابن عبدالبر بحوالہ "پاکستانی عورت دوراہے پر" ۔ از مولانا امین احسن اصلاحی۔ مطبوعہ مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان۔

[2] جنگ جمل کے خاتمے پر حضرت علیؓ نے جناب عائشہ صدیقہؓ سے یہی کہا کہ آپ کا یہ کام نہ تھا۔ آپ کو گھر میں بیٹھنا چاہیے تھا۔ اور حضرت عائشہؓ نے یہ بات تسلیم کر لی۔

اداروں کو چلاتی ہے، جو اقتصادی ترقی کے لیے عمومی جدوجہد کرتی ہے۔ جو جہاد کے محاذ پر قربانیاں دیتی ہے اس کی قوت و صحت کا دارومدار اس کی صحیح ذہنی، اخلاقی اور تہذیبی نشوونما پر ہے۔ یہی وہ بڑا کام ہے جس کے لیے خواتین کی خدمات مختص کی گئی ہیں۔ اگر خواتین اس ذمہ داری سے کنی کترانے لگیں تو ناقص MAN-POWER تیار ہوگی۔ ناقص MAN - POWER کے بل پہ کوئی دوسرا نظام تو شاید چلتا رہے۔ اسلامی نظام کبھی نہیں چل سکتا۔ بلکہ آج عالم انسانی میں جنگ، جرم اور جبریت کی جو فضا بن گئی ہے اور دولت اور خواہش کے بتوں کی جیسی پرستش ہو رہی ہے، یہ سب کچھ نتیجہ ہے اس کوتاہی کا کہ آج جو مرد عالمی قوتوں کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں انہیں گھر میں بچپن کے مقدس ادارے کی محبت بھری فضا میں صحیح اور بھرپور تربیت نہیں ملی۔

ہماری پچھلی طویل تاریخ میں پابندیٔ پردہ کے ساتھ خواتین نے علوم بھی حاصل کیے، انہوں نے کاروبار بھی چلائے کتابیں بھی لکھیں، شعروادب میں بھی حصہ لیا، مگر گھروں کو بحیثیت اسلام کے تہذیبی مراکز تربیت کے اپنی بھرپور توجہ سے محروم نہیں کیا۔ الّا ماشاء اللہ خواتین ایسی بھی ہر دور میں ملتی ہیں جو سیاست، تصوف یا کسی اور دلچسپی کے میدان میں مردانہ حدود تک جا پہنچتی ہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی ہمارے معاشرے میں گھر کا ادارہ ہر قسم کے حالات میں محفوظ اور مضبوط رہا۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کے سقوط، ظالم بادشاہوں کے ظہور، غیر اسلامی طرز سیاست کے نشوونما، فتنوں کے سیلابی عمل اور تاریخ کے بحرانی مدوجزر سے گزرتے ہوئے بھی ہمارے گھروں سے علمائے حق، ائمۂ ہدیٰ، مجاہدین اور شہداء کی صفیں برابر اٹھ اٹھ کے تاریخ کے میدان میں آتی رہیں۔ بعض قیمتی روایات اور قدروں کے باقی رہنے پر ہم ماضی کے طبقۂ اناث کے ممنون ہیں جس نے غیر فطری مساوات مرد و زن کے تصور سے بدمست ہو کر مردانہ مشاغل اختیار کرنے، مردوں سے مسابقت کرنے اور سیر سپاٹوں اور کھلی محفل آرائیوں کی لذت کو اپنے اس عظیم اختصاصی مشن پر قربان کر دیا جو آنحضورؐ اس طبقے کو تفویض کر گئے تھے۔

اور برصغیر کے دور غلامی میں بھی اگر ہمارے اندر ایمان و اخلاق کا کچھ جوہر بچا کھچا موجود رہا تو یہ عطیہ ہے اُن قابل صد افتخار خواتین کا جنہوں نے پچھلی دو ڈھائی صدیوں میں گھروں کے تہذیبی محاذوں پر مضبوط کردار کا مظاہرہ کیا۔ وہ کسی لالچ اور کسی شوق کی کشش سے مسحور ہو کر دوسرے مشاغل کی طرف نہیں لپکیں۔ ورنہ وہی حال ہوتا جیسے کسی جنگی ناکے کا سنتری تتلیاں پکڑنے کے لیے دوڑتا پھرے اور پیچھے دشمن چپکے سے آکر قابض ہو جائے۔

ہماری خواتین اگر فرض میں کوتاہی کرتیں تو کون یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہاں تحریک مجاہدین برپا ہوتی اور انقلاب ۱۸۵۷ء نمودار ہوتا۔ اور خلافت کی مہم زوروں پر چلتی، اور حصول آزادی اور قیام پاکستان کے لیے قوم

اتنی مؤثر اور پُر زور تنگ و تاز کر سکتی۔

ہماری خواتین کے اس پارٹ کو دیکھ کر بالآخر تہذیبِ مغرب نے ہمارے گھروں کے آخری اور پچھلے مورچوں میں مداخلت کرکے ان کے نظام کو درہم برہم کرنے کا فیصلہ کیا۔ مردوں کو تو وہ تعلیم کے تیزاب سے گذار کر اور ان کو اقتصادی ترقی کے لالچ اور غریبی کے خوف سے دوچار کرکے دیکھ چکی تھی۔ ان مساعی کو کم نتیجہ خیز پاکر بالآخر سامراجی قوت نے مسلم خاتون کو ہدف بنایا۔ اور اسے آہستہ آہستہ گھر کے دروازے سے باہر نکالا۔ اور پھر تدریجاً عملِ سحر کرکے اسے رقص کے سٹیج اور نائیٹ کلب کے فرش پر لاکھڑا کیا۔ اور اب ہمارے معاشرے کے آخری تہذیبی مورچے جنہیں گھر کہتے ہیں، کمزور ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

مخلوط تعلیم کوئی سیدھا سادہ عمل اور معمولی واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے معاشرے کی پوری بنیاد ہی ہلا دینے کا سامان ہے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ پاکستان بنتے ہی ہم اپنے شکستہ محاذ کو از سر نو درست کرتے اور اسلام نے مردوں اور عورتوں میں ڈیوٹیوں کی جو تقسیم کی تھی، اسے بحال کر دیتے۔ لیکن ہمارے اندر سے اٹھ کر ہمارے اوپر کار فرمائی اور کارپردازی کرنے والے طبقوں نے ہمیں بصد فخر تہذیبی شکست کے راستے پر آگے ہی آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا۔

دیکھ لیجیے کہ جب سے مخلوط معاشرت کو فروغ ملا ہے ہماری اخلاقی پستی میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ مسرفانہ طریقے پھیل رہے ہیں۔ حلال و حرام کے امتیازات اٹھ رہے ہیں۔ خدا کی محبت اور آخرت کے خوف سے دل خالی ہو رہے ہیں۔ اور مادہ پرستی اور حیوانی نفسانیت رواج پا رہی ہے۔ اور یہ بھی دیکھ لیجیے کہ مخلوط تعلیم اور مخلوط معاشرت لازم و ملزوم ہیں۔

اگر پہلے اس معاملہ میں ہم خرابیٔ احوال پر قابو نہیں پا سکے تو اب ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا چاہیے بلکہ یہ سمجھ کر کام کرنا چاہیے کہ جیسے پاکستان آج ہی بنا ہے اور ہمیں اسے اسلام کا مطلوبہ پاکستان بنانا ہے۔

اسلام کو قبول کرنے یا مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہر فرد، ہر طبقہ اور ہر صنف خدا اور رسولؐ سے براہ راست معلوم کرے کہ اس کے فرائض کیا ہیں اور اس کے حقوق کیا ہیں۔ مردوں سے حقوق طلب کرنے اور مردوں کے خلاف عورتوں کی جنگ حقوق کا سرے سے تصور ہی باطل ہے۔ یہاں LAW GIVER اور ہادی صرف خدا ہے اور اس کے الہامی قانون کی عملی شرح پیش کرنے والا مستند نمائندۂ الٰہی رسولِ برحق ہے۔ جسے اشکال ہو خدا اور رسولؐ کی اتھارٹی کی طرف رجوع کرے اور پوچھے کہ مجھ پر ذمہ داری کیا ہے اور میرے سر فرض کیا ہیں؟

کن پابندیوں میں مجھے کام کرنا ہے؟ میری آزاد مرضی کہاں تک چلے گی؟ اور میری فانی خواہشات و جذبات کا دائرہ تگ و تاز کیا ہے؟ پھر جو امر و نہی سامنے آئے پوری خوشنودیٔ دل کے ساتھ سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے اور اپنا بھرپور رضاکارانہ اور وفادارانہ جذبۂ طاعت پیش کر دینا چاہیے۔

اور اگر بدقسمتی سے کسی کو خدا اور رسولؐ کی مرضیات پسند نہ آئیں تو اس کے لیے کھلا کھلا راستہ ارتداد کا اور مخفی راستہ نفاق کا ہے۔ اس کا دنیا میں نتیجہ ذلت و خواری اور آخرت میں عذاب و عقاب ہے۔

وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی اور پوری انسانیت کی فلاح کے لیے یکسو ہو کر غلبۂ تہذیبِ اسلامی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں، دیانت داری سے اس کے اصولوں کو تسلیم کریں اور آج جو مشغلے اور ادارات اور حقوق و فرائض کی تقسیمیں اسلام کے احکام اور مقاصد کے صریحاً خلاف برسرِ عمل ہیں، ان کو جرأتِ مومنانہ سے توڑ کر اُن کی تعمیر نو کریں۔ ایسا ہی ایک ادارہ مخلوط تعلیم کا ہے۔ جس کے ساتھ مخلوط معاشرت کا منطقی جوڑ ہے۔ ان بے جوڑ چیزوں کو نہ صرف یہ کہ اسلام ساتھ لے کر چل نہیں سکتا۔ بلکہ مخلوط تعلیم و معاشرت اور اس سے پیدا ہونے والی ذہنیت اور اخلاقی احوال احیائے اسلام کی راہ میں شدید ترین مزاحم قوتیں ہیں۔

تو اے مردانِ حق اندیش و خواتینِ صفا کیش! اٹھیے اور موجودہ نقشۂ احوال کو بدل ڈالیے تاکہ اسلام کے تقاضے پورے ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔

اعلانِ جنگ ۔ تہذیبِ حاضر کے خلاف اسلامی نظام کے قیام یا اسلامی تہذیب کے احیاء کا عزم مغربی تہذیب کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ مغرب کی ملحدانہ فکر پر قائم ہونے والی مادہ پرستانہ تہذیب جو ہر شعبۂ زندگی میں اسلام کے اصول و مقاصد سے ٹکراتی ہے۔ اس نے "ترقی" کے خوشنما پردے میں عورت کو نہایت ہی گھٹیا مرتبے پر ڈال دیا ہے اور اس نے دنیا بھر میں "نسائیت بگاڑ" ثقافت کا رنگین طوفان برپا کر رکھا ہے۔

مغربی معاشروں میں عورت کی چلت پھرت، حسین چہروں اور رنگین لباسوں کی نمائش اور اُن کا مردوں کی نقالی میں طرح طرح کے کام کسی تماشاگر کے کرتبوں کی مانند کر دکھانا، مقابلہ ہائے حسن اور فیشن پریڈوں میں شریک ہونا، اور دفتروں اور دکانوں سے لے کر نائٹ کلبوں اور میخانوں تک مردوں میں گھسنا، بہ اوّلِ نظر ہماری عورتوں کو بھی خوب دلکش لگتا ہے۔ مگر معاملہ ایسا نہیں کہ نگاہیں صرف سوسائٹی کے گرد پوش تک ہی رہ جائیں ذرا اندر تک دیکھنے کی ضرورت ہے۔

خواتین کے حوالے سے اس تہذیب دون نہاد کے خلاف ہمارا چارج شیٹ یہ ہے کہ اُس نے پردہ و حیا اور

عصمت و عفت کے تمام تصورات کو ملیامیٹ کر کے، نیز ادارۂ خاندان کی بنیادیں ڈھا کر "آزادیٔ نسواں"، "ترقی نسواں"، "حقوقِ نسواں" اور "مساوات مرد و زن" کے خوبصورت عنوانات کے ساتھ مخلوط معاشرت قائم کر کے عورت کو مردوں کے لیے سہل الحصول، ہمہ وقتی "دلکش ہدوش" اور ہرجائی قسم کا شہوانی کھلونا بنا دیا ہے اور بہ اعتبارِ حقیقت اسے شرفِ انسانیت سے محروم کر دیا ہے۔ اور پوری اولادِ آدم کو جنسی غلاظت کی بیماری میں مبتلا کر دیا ہے۔

جن معاشروں میں حال یہ ہو کہ سیکرٹری اور ٹائپسٹ اور سیلز گرلز اپنے کاروباری مالکوں یا افسروں کی بیویوں کے لیے کھلم کھلا رقیب و حریف بنتی رہتی ہوں، جہاں شادی سے پیشتر لڑکیوں کی اکثریت کا کنوارپن ختم ہو چکتا ہو (اور جو اکا دکا بچ نکلیں، انہیں معنوی طور پر "ملانی" سمجھا جاتا ہو)۔ جہاں دس دس بارہ بارہ سال کے لڑکے لڑکیاں ڈیٹنگ کرتے ہوں اور گھر سے باہر جس کے ساتھ چاہیں رات گذاریں۔ جہاں مانع حمل دواؤں، آلات اور آپریشنوں اور اسقاط کی اباحت اور سہولتوں کے باوجود حرام اولادوں کی کثیر تعداد سوسائٹی میں پلتی ہو۔ اور بعد میں ان میں سے بعض افراد اہم ذمہ داریوں کے حامل بنتے ہوں۔ جہاں ازدواج بلا نکاح کے ساتھ ساتھ کثرت طلاق کی وجہ سے مناکحتوں کی آئے دن شکست و ریخت ہوتی رہتی ہو، جہاں عورت اتنے سستے پن پر آ جائے کہ وہ مردوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے حسن آرائی اور لباسوں کے فیشنوں اور میک اپ اور عریانی اور شراب نوشی اور رقص و سرود اور فلمی ایکٹنگ کے مختلف طریقوں میں جان کھپاتی پھرے۔ جہاں شادی کا راستہ نہ پا سکنے والی کثیر التعداد عورتیں اس سطح سے بھی گر کر داشتائیں بننے کے لیے یوں در بدر گھومیں جیسے کوئی گریجویٹ کلرکی کی نوکری کی درخواست لیے گھومتا ہے، اور جن کی قسمت میں یہ "سعادت" بھی نہ آ سکے وہ پارکوں اور بازاروں اور ہوٹلوں کے آس پاس ہر آئندہ و روندہ سے یہ پوچھتی پھریں کہ "ساتھی چاہیے؟[1]" اور جہاں یہ شہوانیت اتنی بے قابو ہو جائے کہ باغوں کی روشوں اور پارکوں کے پلاٹوں میں

---

[1] کئی سال پہلے ایک رپورٹ "PROSTITUTION IN UNITED STATES" میں انکشاف کیا گیا ہے کہ "جن عورتوں نے زناکاری کو مستقل پیشہ بنا لیا ہے اُن کی تعداد کا کم سے کم اندازہ چار پانچ لاکھ کے درمیان ہے۔ (بحوالہ "پردہ" از مولانا مودودی)۔ نیز اب یہ کاروبار حد درجہ منظم ہو گیا ہے۔ اس کے لیے بکثرت "ملاقات خانے" (ASSIGNATION HOUSES) اور طلب خانے (CALL HOUSES) "شریف" مردوں اور عورتوں کی تفریح کی خاطر تیار رہتے ہیں۔ ایک شہر میں ایسے ۷۸ مشہور اڈے، دوسرے میں ۴۳ تینتالیس اور تیسرے میں ۳۳ تینتیس تحقیق میں آئے (بحوالہ "پردہ" - از مولانا مودودی)۔

اختفا کے کسی اہتمام کے بغیر حیوانی عمل[1] کے مناظر عام ہو جائیں جہاں رابطۂ مرد و زن کے عام اور سستا ہو جانے کی وجہ سے مردوں میں بھی اور عورتوں میں بھی ہم جنسی کی لعنت اتنا زور پکڑ جائے کہ قانون کو اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے پڑیں۔ جہاں تعلیم گاہوں میں جنسی موضوع بالکل کھلا ہو اور جنسی آزادی کی فضا میں "تجربات" کرنا آسان ہو جہاں امراضِ خبیثہ بکثرت پھیل چکے ہوں۔ جہاں فحش فلموں، گھٹیا ناولوں، افسانوں اور نظموں میں عورت کے استعمال سے نفع اندوزی کی جاتی ہو۔ جہاں عورت کے عریاں مجسموں اور شرمناک تصویروں کے ذریعے کمائی کی جاتی ہو۔ جہاں اہلِ کاروبار عورتوں کے حسن و جمال کو لطیف جنسی اکساہٹوں کے ساتھ سمعی و بصری دائروں میں ذریعۂ اشتہار بناتے ہوں۔ جہاں مردوں کی عمومی تواضع کے لیے نائیٹ کلبوں اور شراب خانوں اور رقص گاہوں اور آرائش گھروں میں آزاد عورتیں ٹھیک اس مرتبے پر گر جائیں جس پر تاریک دور کی لونڈیاں ہوا کرتی تھیں۔ جہاں عورت کو جرم اور جاسوسی کی سرگرمیوں میں آلۂ کار بنایا جاتا ہو۔ اور جہاں سیاسی اور کاروباری نوعیت کے شبستانوں میں عورت کو ہوسناکی کے دسترخوانوں پر سجایا جاتا ہو ــــ یہ سب کچھ اتنا بھیانک ہے کہ ان حالات کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے آدمی لرز جاتا ہے[2]۔ جس تہذیب کی معاشرت کا یہ نقشہ ہو۔ اس کے ساتھ اسلام یا مسلمان ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ پس ہمیں اس کے خلاف ٹھیک اس طرح اعلانِ جنگ کرنا چاہیے جیسے اقبال رح نے ضربِ کلیم کے سرورق کا سلوگن لکھا تھا۔

---

[1] اشاعت میں آنے والے احوال میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جرمنی میں (WEEK END) پر مخلوط پارٹیاں پکنک منانے نکلتی ہیں۔ کھلی جگہ پہنچ کر کھانا ہوتا ہے۔ مشروب کا دور چلتا ہے اور پھر لیٹیں آس پاس جوڑے "کارِ دیگر" میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

[2] ایک اور جائزہ بتاتا ہے کہ بیسواؤں (جن میں شوقیہ زانیات بھی شامل ہیں) کو اب کمپنی گرلز، کال گرلز یا سوسائٹی گرلز کہا جاتا ہے۔ ان سے سارا معاملہ فون پر اس طرح طے ہو جاتا ہے جیسے کسی ڈاکٹر یا وکیل سے (U.S.A CONFIDENTIAL) بحوالہ تعمیر انسانیت از پروفیسر حمید صدیقی۔

حالات کا یہ بگاڑ فوری طور پر رونما نہیں ہو گیا بلکہ صنعتی انقلاب کے وقت جس درخت خبیث نے محض کونپلیں ہی نکالی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ بڑا ہوا۔ شاخیں پھیلاتا گیا۔ اور آج اپنے زہریلے کانٹوں اور کسیلے پھلوں کے باوجود مغربی معاشروں اور حکومتوں کے بس میں نہیں کہ اسے اکھاڑ پھینکیں۔ اس طرح آج ہمارے ہاں مغربی (باقی بر صفحہ آئندہ)

اور مخلوط تعلیمی ادارے مغرب کی اس فاسد تہذیب کے اڈے ہیں۔ اگر ہم اسلام سے وفاداری چاہتے ہیں تو ان اڈوں کو ختم کر دینا ہوگا۔ مخلوط تعلیم کے خاتمے کو تہذیب مغرب کے خلاف جہاد کی راہ میں قدم اوّل سمجھنا چاہیے۔

ماحصل ہم نے اُن مقاصد کو سامنے رکھ دیا ہے جو ایمانی اور رافادی نقطۂ نظر سے مخلوط تعلیم کا طریقہ ترک کر کے خواتین کے لیے تعلیم کا الگ انتظام کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ غور کرنے والوں کے لیے یہ مواد فکری تحریک کا مؤثر ذریعہ بھی ہوگا اور صحیح نتیجے تک پہنچنے میں ممد بھی۔

"جامعۂ خواتین کیوں ؟" کا جواب ہو چکا۔ اب مسئلے کا دوسرا پہلو زیرِ گفتگو آتا ہے کہ "خواتین یونیورسٹی کس طرح؟" یعنی وہ کیسے چلے گی ؟ اور اس کا تنظیمی اور تدریسی خاکہ کیا ہوگا؟

(۲)

چند ابتدائی اُمور ۱۔ سب سے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ جامعۂ خواتین قائم کرتے ہی یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اس انقلابی اقدام کے ساتھ اسی ادارے سے اسلامی نظامِ تعلیم کا نفاذ شروع کر دیا جائے گا۔ جس کے لیے برسوں سے مطالبات اُٹھائے جاتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں تعلیم کا مقصد، درس گاہ کا ماحول، اساتذہ کا کردار، درسیات کا نظام سب کچھ اسلام کے اصول و مقاصد کے مطابق ہونا چاہیے۔

۲۔ جامعۂ خواتین کو متذکرہ بالا مقاصد کے ساتھ وجود دینے کے لیے لازمی معنی یہ ہیں کہ آئندہ کے لیے مخلوط تعلیم کا سلسلہ اس ملک میں جاری نہیں رہنا چاہیے۔ بالفاظِ دیگر ایک یونیورسٹی کے تجربے سے آغاز کر کے ایک تین یا پانچ سالہ منصوبے کے تحت مزید یونیورسٹیاں اور خواتین کے کالج اتنی تعداد میں قائم کر دیے جائیں کہ خواتین مردوں کے کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کی محتاج نہ رہیں۔ یہ صورت مسلم تہذیب کے نقطۂ نظر سے کسی طرح بھی معقول نہیں ہو سکتی کہ خواتین کے لیے جداگانہ تعلیمی ادارات کے ساتھ ساتھ مخلوط تعلیم بھی چلتی رہے۔ ایک مختصر مدت میں خواتین کے لیے اتنی جداگانہ تعلیم گاہیں قائم کر دی جائیں کہ انہیں مخلوط تعلیم کے چکر سے نکالا جا سکے۔ وہ وقت جلد آ جانا چاہیے کہ

(حاشیہ صفحہ سابق) تہذیب و معاشرت ابتدائی مرحلے میں ہے، اگر اس وقت اس کے مفاسد کا انسداد نہ کیا گیا تو آگے چل کر اس کی اذیت ناکیوں کے باوجود اس سے تعرض نہ کیا جا سکے گا۔

مخلوط تعلیم یکسر ممنوع ہو اور کوئی طالبہ لڑکوں کے کسی کالج (یا یونیورسٹی) میں داخلہ حاصل نہ کر سکے جس شہر یا علاقہ میں خواتین کے لیے جداگانہ یونیورسٹی یا کالج کا انتظام ہو جائے، اس میں مخلوط اداروں میں تعلیم پانے والی طالبات کی لازماً شفٹنگ ہو جانی چاہیے۔

۳۔ عدم اختلاطِ صنفین (SEPERATION OF SEXES) کے اسلامی اصول پر اگر کام کرنا ہو تو پھر تعلیم کے علاوہ دوسرے دائروں میں بھی خواتین کے لیے ضروری ادارات الگ قائم کرنے ہوں گے۔ جہاں کہیں ہسپتال موجود ہیں اُن کو توسیع دی جائے اور ہر سرکاری ہسپتال کے زنانہ وارڈ میں صرف لیڈی ڈاکٹروں اور نرسوں کا تقرر کیا جائے۔ عائلی زندگی سے متعلق خواتین کے لیے جداگانہ عدالتیں قائم ہوں جن کے مجسٹریٹ اور وکلاء بھی طبقۂ خواتین میں سے ہوں۔ خواتین ڈینٹسٹوں اور آئی سپیشلسٹوں کا انتظام بھی ہونا چاہیے۔ اسی طرح شہروں اور قصبوں میں اُن کے لیے علیحدہ لیکچر ہال اور کھیل کے میدان مختص ہوں، جن کے گرد فصیلیں ہوں۔

ان تعمیری کاموں کے ساتھ پہلے ہی قدم پر مخلوط ثقافتی تقریبوں اور نائٹ کلبوں وغیرہ کا سلسلہ بیک قلم بند کر دینا چاہیے۔ مرد اور عورتیں علیحدہ علیحدہ تقاریب کا اہتمام کریں۔ اور اپنے لیے صاف ستھری مجالس یا تفریحی کلب (جہاں لائبریریاں، کھیلوں اور بحث و نظر کے انتظامات ہوں) بنائیں۔

مخلوط ثقافتی تقاریب اور مخلوط کلبوں اور ہوٹلوں اور پارکوں کی مخلوط تفریحی نشستوں کو ممنوع قرار دینے کے ساتھ ساتھ سرکاری افسروں اور ملازمین (اور اُن کی بیگمات اور زیر کفالت افراد) کو ایسی تقاریب و مجالس میں شرکت کرنے اور اُن کی مالی یا کسی اور طرح کی مدد کرنے سے روک دیا جائے۔

یہ ایک مختلف جائز صورت ہوگی کہ مثلاً مردوں کی مجالس میں کوئی لیکچر سننے کے لیے پردے کے اہتمام کے ساتھ خواتین شرکت کریں۔ یا خواتین کے اجتماع میں ضروری احتیاط کے ساتھ کوئی مرد خطاب کرے۔

مخلوط مجالس و تقاریب کو روکنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خواتین کی اپنی سوشل سرگرمیاں بڑھ جائیں گی اور وسیع تر حلقوں کی ایسی خواتین بھی دل چسپی لینے لگیں گی جو مخلوط تقاریب و مجالس سے کنارہ کش رہتی ہیں۔ اور ایسی سرگرمیوں میں جس طرح کے مفاسد اُبھرتے ہیں اُن کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔ اپنے دائرے میں خواتین کی سوشل سرگرمیوں کے بڑھنے، اداروں میں خواتین کی زیادہ تعداد کے دل چسپی لینے سے "ترقی نسواں" کا کام بہتر طور سے انجام پائے گا۔ نیز اس تبدیلی کے نتیجے میں جو مختصر سا مخالفِ پردہ، اباحت پسند اور مغرب زدہ عنصر خواتین کی نمائندگی اور قیادت سنبھالے ہوئے ہے، اور اِن کی مجالس و سرگرمیوں پر حاوی رہتا ہے، اس کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ غریب عوام

میں سے اور محبِ دین حلقوں میں سے نئی خواتین اور نوجوان لڑکیاں آگے بڑھیں گی۔ اور موجودہ غلط رَو تحریکِ نسواں کا سیکولر رنگ کٹ جائے گا۔ بڑے گھرانوں اور عہدوں اور سرمائے اور لباس اور آرائش کے زور سے جس گروہ نے مغربی معاشرت کی دھاک بٹھا رکھی ہے اور جو ساری قوم کو زبردستی دھکیل کر مخالفِ اسلام تہذیبی سامراج کے پھندوں میں جا پھنسانا چاہتا ہے وہ قیادت و نمائندگیِ خواتین کی اس مناپلی سے محروم ہو جائے گا جو سرکاری تائید و حمایت سے قائم ہو کر مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔

مخلوط ثقافتی اور سوشل سرگرمیوں میں فضا تفریحی دائروں میں تو شدید طور پر جنسیت زدہ ہوتی ہی ہے نسبتاً سنجیدہ دکھائی دینے والی حرکات میں بھی وہ کچھ نہ کچھ خلل انداز ہوتی ہے۔ چلے ہیں ہلال احمر کے لیے چندہ لینے اور ساتھ ہی شوخ و شنگ لباس و آرائش کا مظاہرہ بھی ہے۔ لگے ہیں خدمتِ خلق کے کسی کام میں اور ساتھ ہی ناز و ادا اور آوارہ نگاہی کے کرشمے بھی ہیں۔ کر رہے ہیں مصیبت زدوں میں تقسیم پارچات اور فوٹو گرافروں کو حکم ہے کہ وہ ساتھ ہی تصاویر لیں۔

درحقیقت مخلوط سرگرمیاں جو کچھ بھی افادیت رکھتی ہوں، ان میں تخریبی عوامل موجود رہتے ہیں۔ پس اب یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے۔

ایک اصولی بات نظریات و معتقدات کے تحت جب کسی معاشرے میں کوئی انقلابی قسم کا قدم اٹھایا جا رہا ہو اس کی کامیابی کا انحصار دوسری باتوں کے علاوہ سب سے پہلے اس اصولی بات پر ہوتا ہے کہ اس کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ کرنے والے، اس کا خاکہ بنانے والے، اس کی تفصیلات طے کرنے والے ایمانی لحاظ سے یکسو اور مضبوط ہوں۔

ہمارے یہاں جامعۂ خواتین کے قیام یا مخلوط تعلیم کے ترک کا فیصلہ کسی معمولی تبدیلی کی نشاندہی نہیں کرتا۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، سیکولرازم کے طلسم کو توڑنے اور مغرب کے تہذیبی سامراج کے خلاف جنگ چھیڑنے کا اقدام ہے۔ دانشوروں اور سیاست کاروں اور انتظامیہ کے کارپردازوں میں سے ایک بڑی تعداد اس تذکرے کے چھڑتے ہی پیچ و تاب کھا رہی ہے۔ ایک عنصر ایسا ہے جو فنِ منافقت میں ایسی مہارت رکھتا ہے کہ ایک ناپسندیدہ پروگرام کے حق میں قصیدہ خوانیاں کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے، پروگرام کی ذمہ داریوں میں بڑی دلچسپی سے شریک ہوتا ہے اور پھر اندر ہی اندر اسے ناکام کرنے کی تدابیر ایسی خوبصورتی سے عمل کرتا ہے کہ پروگرام کے پرجوش علمبردار بھی سجدۂ سہو کر لیتے ہیں۔

جامعۂ خواتین کے قیام کے سلسلے میں اصل مسئلہ یہی ہے کہ آیا ہم ایسے دس پانچ ذہین اور فعال افراد کو اکٹھا کر سکتے ہیں جو دیانتداری سے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ہمیں کوئی امید افزا نقشہ بنا کے دے سکیں۔ ایسے افراد جن کی مومنانہ ذہنیت کا انعکاس پہلے سے ہو رہا ہو، جن کے ہاتھوں اسلامی مقاصد کے لیے ماضی میں کچھ کام ہو چکے ہوں، جن کے حق میں یہ اعتمادِ عام پایا جاتا ہو کہ ہاں یہ لوگ اگر ہماری تعلیم ہماری تقدیر بنانے کے لیے آگے آئیں تو کچھ اچھے نتائج پیدا ہو سکیں گے۔

انقلابی کاموں کے لیے محض ٹیکنیکل مہارتوں پر دار و مدار نہیں کیا جا سکتا۔ ٹیکنیکل اور فنی لوگ اپنے ایک خاص طرزِ فکر کے قیدی ہوتے ہیں۔ اور اسی طرزِ فکر کو مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ انقلابی کاموں میں ایمانی شعور کے ساتھ تخلیقی فعالیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایمانی شعور سے آراستہ لوگ اگر زمامِ کار ہاتھ میں لے کر ٹیکنیکل افراد سے اپنے معینہ خطوط کار پر مدد لیں تو کام چل سکتا ہے۔

اگلے مرحلے کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا جامعۂ خواتین کے لیے ہمارے پاس ڈی۔ سی اور لیکچرار اور پروفیسر اور پرنسپل بننے کے لیے اور درسیات مرتب کرنے کے لیے ایسی خواتین مناسب تعداد میں ہیں جو علمی قابلیت اور تدریسی و انتظامی تجربے کے ساتھ ساتھ ایک سچے مسلمان کی ذہنیت سے مالا مال ہوں اور جو خود احیائے اسلام کا جذبہ رکھتی ہوں۔ اور جنہیں مخلوط تعلیم اور اس طرزِ تعلیم کو ہمارے سر منڈھنے والی مخالفِ اسلام تہذیب ناپسند ہو۔ اس معاشرے کا تعلیم یافتہ خصوصاً دانشوروں اور فنی ماہرین کا طبقہ ایسا پیچیدہ لگتا ہے کہ بیک نظر کام کے آدمیوں کو پہچاننا مشکل ہے۔ خاص طور سے اسلام گریز عناصر نے ایسے ایسے خول اپنے اوپر چڑھا رکھے ہیں اور ایسے مصنوعی چہرے سجا رکھے ہیں اور پھر وقت وقت کی بات وہ ایسے شاندار انداز میں کرتے ہیں کہ یوں لگتا ہے کہ جیسے اسلام کے بہترین جان نثار فرلینڈنگان سے تعارف ہو رہا ہے۔ ان پیچیدگیوں کے عناصر میں مختلف اقسام کے لوگوں کو ان کے اندازِ قد سے صرف وہ تو تیں ٹھیک طرح پہچانتی ہیں جو برسوں سے کھرے انسانوں کی تلاش کا کام کر رہی ہیں۔ اور تجربات کی بنا پر جن کی نگاہیں ان مسلمانانِ عظیم کو پہچانتی ہیں جو دراصل مخالفِ اسلام ہیں۔

اسلام کی راہ پر کوئی ایک انقلابی قدم اٹھانے میں بھی وہ سارا عنصر بے کار ہے جس میں کوئی الحاد پسند ہے، کوئی سیکولر مائنڈڈ (SECULAR MINDED) ہے، کوئی اشتراکیت زدہ ہے، کوئی مغرب

پرست ہے اور کوئی بندۂ مفاد[1] — ان اوصاف کی کچھ بھی جھلک کسی میں پائی جاتی ہو تو اسے جامعۂ خواتین یا کسی دوسرے اسلامی پروگرام میں حصہ لینے کے لیے پاس بھی نہیں پھٹکنے دینا چاہیے۔ خاص طور سے مرحلۂ آغاز میں یہ احتیاط اشد ضروری ہے۔ جب کام ہو جائے اور گاڑی چل جائے تو پھر ان کی خطرناکی کم تر درجے میں ہوگی۔ اس اصولی بات کو اگر ہم پورا نہ کر سکے تو بمشکل ہی یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ جامعۂ خواتین کا یا کوئی دوسرا خواب جامۂ عمل پہن سکے گا۔ بلکہ خطرہ تو یہاں تک ہے کہ یہ ماہرین و دانشور جامعۂ خواتین کو ایسے خطوط پر استوار کرا دیں کہ کل اس قدم کو واپس لینا پڑ جائے۔

پس کام اور کام کی اسکیم یا پروگرام سے پہلے موزوں آدمیوں کی ضرورت ہے۔

(باقی)

[1] یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قادیانیوں اور مخفی قادیانیوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے کہ یہ لوگ بھی اسلامی نظام کی طرف معاشرے کی پیش قدمی کو دل سے ناپسند کرتے ہیں۔ جن مسلمانوں کی تکفیر و تذلیل ان کے ایمان کا جزو ہے وہ ان کے تصورات کے تحت ان کے ہاتھوں اسلام کا نفاذ کیسے پسند کر سکتے ہیں۔

باب نہم

رُوداد ِ ابتلاء: احمد رائف مصری

(۱۰)

جناب خلیل الحامدی صاحب

سٹور نمبر ۶ کی دُنیا

یہ سٹور ایک کمرے پر مشتمل ہے جو پہلی منزل میں جیل کے بڑے آہنی دروازے میں داخل ہوتے وقت دائیں جانب آتا ہے۔ اس کے سامنے پانی کا کنواں ہے۔ اس کی ایک کھڑکی "بڑی جیل" کی بیرونی سمت کھلتی ہے جہاں فوجی جیل کا بڑا پارک ہے۔ اس حجرے کے عین مقابل اسپتال واقع ہے۔ سامنے دُور جہاں راستہ بند ہو رہا ہے۔ دفاترِ تفتیش کی عمارت واقع ہے۔

یہ کمرہ دس سے زیادہ افراد کی گنجائش نہیں رکھتا۔ اور یہ بڑی تعداد جو اس کے اندر بھر دی گئی ہے بڑی تنگی سے رہ رہی ہے۔ صبح جب سورج نے اپنی کرنیں ڈالیں اور ہم نے اس کمرے میں موجود لوگوں کو گن کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان کی تعداد پینتالیس ہے۔ حالانکہ اس کمرے کا جسے سٹور نمبر ۶ کہا جاتا ہے، پورا رقبہ ۲ + ۳ میٹر ہے۔ اور پیشاب، پاخانے اور پیپ کی بدبو سے بھر رہا ہے۔ دبی دبی اور گھٹی گھٹی آہیں اُٹھ رہی ہیں۔ کیونکہ ہدایات یہ ہیں کہ قطعاً کوئی آواز بلند نہ ہو۔ ورنہ یہ سگانِ گرسنہ جنہیں زخموں سے اُٹھنے والی بُو بڑی کشش کر رہی ہے کمرے میں داخل ہو جائیں گے۔ یہاں یہ خیال رہے کہ ہم جب اسٹور میں داخل ہوئے تو ہم میں سے ایک بھی ایسا فرد نہ تھا جو مجروح نہ ہو چکا ہو اور اس کے زخموں سے مسلسل خون نہ بہہ رہا ہو۔ جزع و فزع کے عالم میں ہمیں اسٹور میں داخل کر دیا گیا، اور گھٹا ٹوپ اندھیرے کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے اُوپر گرتے رہے۔ اور جو شخص جس حالت میں جہاں بیٹھ گیا سورج طلوع ہونے تک اُسی طرح پتھر بنا رہا۔ پہرہ داروں نے وارننگ دی تھی کہ وہ کوئی آواز یا کھڑکھڑاہٹ نہیں سُننا چاہتے۔ اور جو ایسا کرے گا اُس

کی سزا موت ہے۔ ہم جانتے تھے کہ اُن لوگوں کی دھمکیاں جھوٹ نہیں ہوتیں۔ بلکہ جو کہتے ہیں کر گذرتے ہیں۔

ہمارے ایک ساتھی نے اس سکوت کو توڑ ڈالا۔ اُس نے اپنا پیشاب روک رکھا تھا۔ وہ ہم سب میں سے بہت کم بیت الخلاء کی طرف جاتا تھا اور اب اُسے بیت الخلاء گئے ہوئے ۳۶ گھنٹے ہو رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ دروازے کے باہر ایک بدصورت دیو نما سپاہی کا سایہ نظر آیا جس نے ہاتھ میں تازیانہ اُٹھا رکھا تھا۔ وہ گلا پھاڑ کر کہنے لگا: کیا کوئی شخص بیت الخلاء جانا چاہتا ہے۔ جواب میں ہم سب خاموش رہے۔ سپاہی نے نہایت فحش گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اور پھر وہی سوال دُہرایا۔ اندھیرا گھٹا ٹوپ تھا۔ لوگوں کے چہروں کے تاثرات بھانپنا مشکل تھا۔ لیکن قدرتی طور پر خوف ایک ایسی چیز تھی جو سب میں قدر مشترک تھی۔ ہمارے ساتھی کا کچھ حوصلہ بڑھا۔ اور اس نے بیت الخلاء جانے کی درخواست کی۔ ہمارا یہ نظر بند ساتھی مصری فوج میں جرنیل کے عہدہ پر فائز تھا۔ اس زشت رُو سپاہی نے اُسے باہر نکالا۔ اور وہ ہم قفسوں کے اُوپر سے گزرتا ہوا دروازے سے باہر آیا۔ دروازے کے باہر بجلی کی نہایت تیز روشنی کے اندر سپاہی نے اس عظیم فوجی افسر کو یکایک مارنا شروع کر دیا۔ اور بہت بُری طرح اُسے مارا۔ اس کے بعد کتے آئے اور ہماری آنکھوں کے سامنے اُس کے جسم کے بعض حصوں سے گوشت نوچنے لگے۔ یہ سزا دینے کے باوجود اُس بے چارے کو انہوں نے کنوئیں میں پھینک دیا۔ جب وہ مرنے لگا تو کنوئیں سے نکال کر کمرے کے اندر دھکیل دیا۔ خون اور پانی کے قطرے اس کے جسم سے ٹپک رہے تھے۔ اس حال میں اُسے کانپتا ہوا چھوڑ گئے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد اس کے کپڑے تو خشک ہو گئے مگر خون نہ خشک ہو سکا۔ یہ "درس" اُسے اس لیے دیا گیا کہ وہ آئندہ بیت الخلاء کا رُخ کرنے سے بے نیاز ہو جائے۔ چنانچہ اُس نے اپنی جگہ پر ہی پیشاب بھی کیا اور پاخانہ بھی۔ اُس کی بُو سے قریب بیٹھنے والے انسانوں کی ناک میں دم ہو گیا۔ میں بھی اُن میں شامل تھا۔ یہ معاملہ دیکھ کر ہر شخص دم بخود اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اور اپنے افکار و آلام میں کھویا رہا۔ نہ کہیں کوئی سرگوشی ہوتی اور نہ سانس کی آواز سنائی دیتی۔ ہر پندرہ منٹ کے بعد دروازہ کھولا جاتا اور ایک نیا نظر بند ہمارے اُوپر لا کر پھینک دیا جاتا۔ انسانوں کو یہاں لا کر اسی طرح بے دیکھے بھالے پھینکا جاتا جیسے وہ انسان نہ تھے بلکہ آلوؤں کی بوریاں تھے۔ یہ نئے لوگ یا تو تحقیقات کے مرحلے سے گذر کر یہاں آ رہے تھے یا گھروں سے پکڑ کر سیدھا اس جگہ انہیں پہنچایا جا رہا تھا۔ ایک ہنگامۂ دار و گیر اور غلغلۂ رستاخیز بپا تھا۔

تاریکی شدید تھی۔ ہم چہرے سے کسی کو شناخت نہ کر سکتے تھے۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ تاریکی کے اندر کچھ

ہاتھ اُٹھ رہے ہیں اور اس ڈر سے کہ کہیں سپاہی سخت گیری پر نہ آجائیں زخمی ساتھیوں کے موہنوں سے اُٹھنے والی ہلکی ہلکی دلگداز آہوں کو دبانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم بھوک سے تڑپ رہے تھے اور پیاس سے نڈھال ہو رہے تھے۔ لیکن خوف کے سامنے بھوک اور پیاس کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے، ایسا خوف جو سینوں میں سے دلوں کو چیر چیر کر نکال رہا تھا۔ کچھ وقفے کے بعد ایک شخص نے دبی دبی آواز سے کہا: "بھائیو!" یہ لفظ اس کے منہ سے نکلا ہی تھا کہ عظیم فوجی افسر جس کے بول و براز سے آلودہ کپڑوں سے حد درجہ تکلیف دہ بدبو اُٹھ رہی تھی، ایک دم بول اُٹھا: "تو کیا چاہتا ہے۔ کیا جس حالت میں ہم گرفتار ہیں کیا تمہاری نظر میں یہ کافی نہیں ہے"۔

لیکن وہی دبی ہوئی آواز پھر اُٹھی اور وہ شخص بااصرار کہنے لگا:

میں نے ایک نہایت ضروری چیز کا انکشاف کر لیا ہے . .

کونسا انکشاف ؟

دروازے کی ایک جانب ربڑ کے دو برتن پڑے ہیں۔

کیا مطلب ؟

میرا خیال ہے کہ ان میں سے ایک برتن پیشاب کرنے کے لیے ہے اور دوسرا پانی پینے کے لیے۔ لیکن میں معین طور پر یہ نہیں جان سکا کہ کون سا پیشاب کے لیے اور کونسا پانی پینے کے لیے ہے۔

ہمارا ایک ساتھی یہ سن کر چپکے چپکے اُٹھا اور ایک برتن میں اُس نے پیشاب کیا اور دوسرے میں اُسے پیا۔ اس مبارک رات کو میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ پیشاب پیا۔ پیاس سے نڈھال انسان جان بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ چارہ جوئی کرتا ہے۔ مگر کیا پیشاب پینا کوئی آسان بات ہے ؟ یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ یہ رات ایسی شدید و پُرہول تھی کہ ہمارا کوئی ساتھی بھی قطعاً نہ سو سکا۔ اس کے بعد اور بھی ایسی متعدد راتوں سے واسطہ پیش آیا۔ ہم جس درد و آزار سے دوچار تھے اُس کی وجہ سے ہم یہ کم ہی سوچ پاتے تھے کہ جب ہمیں اچانک تحقیقات کے لیے بلایا جائے گا وہاں ہم کیا جواب دیں گے یا کیا موقف اختیار کریں گے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ مجھے تحقیقات کا سامنا کرنے کے لیے چالیس روز سے زیادہ عرصہ تک انتظار کرنا پڑا۔ الوزعبل کی تحقیقات اور فوجی جیل کی تحقیقات میں زبردست فرق پایا۔ فوجی جیل کے اندر تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ تازیانوں سے یا لوہے کی گرم گرم سلاخوں سے داغ کر نظر بند کو مار ڈالا جائے، اُس کے ناخن اُکھاڑ دیے جائیں، کتوں سے اس کی تکا بوٹی کرا دی جائے، اُسے بجلی کے جھٹکے دیے جائیں، فوجی بوٹوں سے

اُسے ٹھوکریں مار مار کر بے جان کر دیا جائے ——

رات اپنی ہولناک فضا اور دلگداز تاریکی میں ڈوب رہی تھی۔ اسی دوران دروازہ کھلا اور دو مزید انسان کمرے میں لاکر پھینک دیے گئے۔ اس کے بعد ایک شخص کا نام پکارا گیا۔ مطلوبہ شخص خوف کے مارے کانپتا ہوا اٹھا۔ اس پہ اس قدر لرزہ طاری ہو گیا کہ اس کے دانتوں کے بجنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تاریکی کے اندر میں نے اسے نگاہیں جما کر دیکھا۔ باہر گراؤنڈ سے آنے والی مدہم روشنی دروازے کو چھو رہی تھی۔ جب وہ شخص دروازے میں سے گزرا تو میں نے اسے پہچان لیا، یہ وہی مسکین فوجی افسر تھا جو رات کی زدوکوب کے اثرات سے ابھی تک آرام نہ کر پایا تھا۔ اسے پھر تحقیق کے لیے طلب کر لیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ سٹور کے اندر جتنے انسان محبوس تھے وہ میری اس عاجزانہ دعا میں شریک تھے کہ یہ درماندہ فوجی افسر اب معلوم کس انجام سے دوچار ہونے والا ہے۔ خدا اس کی مصیبت کو آسان فرمائے۔

سپیدۂ صبح کے پہلے ہی دھارے نمودار ہوئے تو ہم میں سے ہر شخص نے اپنے ساتھی کا چہرہ دیکھا — اتنے میں دروازہ کھلا اور چار دیو نما سپاہی مذکورہ بالا عظیم افسر کو ہاتھوں پہ اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ تازیانوں کی ضربوں سے اس کے بدن کی دھجیاں اڑ چکی تھیں۔ کتے اس کے جسم کو پیٹ بھر کر نوچ چکے تھے۔ سپاہیوں نے اسے یکایک ہمارے اوپر لاکر ڈال دیا۔ اس کے گرنے کی آواز یوں آئی جیسے گھاس کی گٹھڑی لاکر پھینک دی گئی ہو۔ ہم میں سے کسی کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ اسے چھوئے یا اس کے الم کو ہلکا کرے جو اس کی گھٹی گھٹی دل گداز آہوں، اور اس کے خون میں لت پت کپڑوں سے عیاں ہو رہا تھا۔ ہمارے لیے یہ پتہ لگانا بھی مشکل تھا کہ خون کا کونسا دھارا کس جگہ سے بہہ رہا ہے۔ وہ سراپا زخم تھا، گہرے زخم۔ ہر حصے سے خون بہہ رہا تھا۔ سورج کی کرنیں پھوٹیں تو اس عظیم فوجی افسر نے یکبارگی آنکھیں کھولیں اور اس نے دنیا پہ ایک نگاہ واپسیں ڈالی اور پھر ایک زور سے چیخ ماری۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ گویا جیل کا گوشہ گوشہ کانپ گیا ہو۔ اس چیخ کے ساتھ ہی وہ ابدی نیند سو گیا۔

اس گراں بار اور ظلمت آمیز رات کی جو تفصیلات بعد میں ہمیں ملیں ان سے معلوم ہوا کہ اس رات دو انسانی جانیں ضائع ہوئیں اور چالیس انسان بری طرح زخمی ہوئے۔

کچھ سپاہی آئے اور انھوں نے مسکین فوجی افسر کی لاش ایک اونی کمبل میں لپیٹ دی اور اسے کسی ایسے مقام پہ لے گئے جسے کوئی شخص نہیں جانتا۔ اب قیامت ہی کے روز وہ اٹھ کر اپنے ظلم کے انکشافات کرے گا۔

دن طلوع ہوگیا۔ سورج چمک اٹھا۔ اور آلات تعذیب کی جھنکار شروع ہوگئی۔ میں آپ سے یہ بات چھپا کر نہیں رکھتا کہ رات جو لوگ ملک عدم کو سدھار گئے تھے ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی کسی شخص نے حزن و ملال کا اظہار نہیں کیا۔ ہم میں سے کسی انسان کے دل میں غم و اندوہ کے لیے کوئی جگہ نہ رہی تھی۔ ہمارا بال بال درد اور خوف میں گُتھا ہوا تھا۔ بلکہ ہم لوگ اُن انسانوں پر رشک کرتے تھے جو عذاب سے نجات پاکر درجۂ شہادت پالیتے اور خدا کے حضور میں "سرخ رُو" ہوکر حاضر ہو جاتے۔

اسٹور کا دروازہ کچھ نیم وا ہوا۔ اور مجھے اپنی اُن آنکھوں کی مدد سے جیل کا صحن جھانکنے کا موقع مل گیا جو رات کی شدید گرمی کے اندر بے خوابی، درد اور پیشاب کے بخارات کی وجہ سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ مگر ان بوجھل آنکھوں نے ایسا منظر دیکھا جسے میں کبھی نہ بھولوں گا۔

سپاہیوں کا ایک جتھا ایک ضعیف العمر انسان پہ کوڑے سے کر ٹوٹا پڑ رہا ہے اور اُسے بُری طرح مار رہا ہے۔ بوڑھا چیخیں مار رہا ہے اور دہائی پہ دہائی دے رہا ہے۔ اور ہر مرتبہ دہائی کے جواب میں اس کے لاغر اور کھوکھلے جسم پر آتش بار کوڑوں کی بوچھاڑ کر دی جاتی ہے۔ رحم کی بھیک مانگتے مانگتے اُس کی گِھگی بندھ چکی تھی اور آخر کار وہ خاموش ہوگیا اور اُس کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھ گئے۔ میں یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ اُس کے ہاتھ آسمان کی طرف نالہ و فریاد کے لیے اُٹھے تھے یا دُعا و التجا کے لیے۔

سامنے کی دیوار پہ آبی رنگوں سے بنی ہوئی دو تصویریں منقش تھیں۔ ایک جمال عبدالناصر کی تصویر اور دوسری عبدالحکیم کی تصویر۔ یہ تصویریں کسی آرٹسٹ کا فن نہ تھیں۔ بلکہ ویسی ہی تھیں جیسے پہلی جماعت کے بچے بناتے ہیں۔ ان کے اوپر جلی حروف میں یہ مقولہ درج تھا۔ "میں بھوکوں کو دھوکا دیتا رہتا ہوں تاکہ میں حسبِ منشا زندگی بسر کرسکوں" معلوم نہیں یہ مقولہ کسی شوریدہ سر نے یہاں درج کر دیا یا اس کا نقاش کوئی میرے جیسا بدنصیب انسان تھا یا کوئی جلاد۔

میں محسوس کرتا تھا کہ میری رُوح کسی بھیانک کابوس کے اندر اُتر چکی ہے۔ میرے ارد گرد جو کچھ ہو رہا ہے۔ میرے اندر اُس کے بارے میں سوچنے کا بھی یارا نہیں رہا۔ نیز یہاں کوئی ایسی دلیل بھی سامنے نہ تھی جو اس تمام عذاب و آزار کی وجہ جواز بن سکے۔ یہ بھیانک ڈرامہ کس شکل میں ختم ہوگا، اس کا تصور بھی میرے لیے محال تھا۔ ہر آنے والی گھڑی کا میں سو سو رنگ سے جائزہ لیتا۔ تعذیب کی چکی جو مجھے پیس رہی تھی، وہ محدود طاقت رکھنے والا انسان ہونے کی حیثیت سے برداشت سے باہر تھی۔ مگر ان حالات کے سامنے

مکمل سرافگندگی کے سوا اور کیا چارہ تھا۔

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

کشاں کشاں میں اپنے دل سے کبیدگی اور مایوسی کے اثرات دُور کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے اُن سچے اہلِ ایمان کو یاد کرنا شروع کر دیا جنہوں نے جان جوکھوں میں ڈال کر اسلام کی بنیاد رکھی تھی۔ اور اپنے اللہ سے انہوں نے جو پیمان باندھا تھا اُسے سچ کر دکھایا تھا (صدقوا ما عاهدوا الله عليه)۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے دُعا کرتا کہ میں بھی اُن میں شامل کر لیا جاؤں، اور کسی چون وچرا اور نالہ وشیون کے بغیر یہ سنگین آزمائش جگرداری کے ساتھ بھگت لوں۔

ایک ترش رُو، کج خُو اور بدزبان سپاہی اسٹور میں داخل ہوا۔ معلوم ہوا کہ اُس کا نام رُوبی ہے۔ اندر قدم رکھتے ہی رُوبی نے ہم پر فحش گالیوں کی بارش کر دی۔ ان میں سے چند گالیاں تو ہم سمجھ رہے تھے اور بعض سمجھنے سے قاصر تھے۔ البتہ ہمیں یہ یقین تھا کہ یہ انسان ہمیں بہت ہی گندی گالیاں دے رہا ہے۔ اُس نے اپنے ایک ہاتھ میں ایک غلیظ برتن اُٹھا رکھا تھا۔ چنانچہ اپنی غلاظت آلود انگلیوں سے اُس نے ہم میں سے ہر ایک کو طعمیہ (مصر کا عوامی کھانا) کا ایک ایک ٹکڑا دینا شروع کر دیا۔ تقسیم کے دوران دو مرتبہ اُس نے اپنی ناک صاف کی اور اُسے اپنے سرکاری لباس کے ساتھ پونچھا۔ مجھے یاد ہے کہ اُسے دیکھ کر میرے دل میں کوئی کراہت پیدا نہیں ہوئی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا صورتِ حال کراہت کیا ہر چیز سے بالا و برتر ہو چکی تھی۔ طعمیہ تقسیم کرنے کے بعد اُس نے ہمارے سروں پر چند روٹیاں پھینک دیں اور واپس چلا گیا۔

ہم نے روٹیاں گنیں تو وہ روٹیاں کیا تھیں چند ٹکڑے تھے جن کا مجموعہ صرف پانچ روٹیاں بنتی تھیں۔ جب کہ ہماری تعداد پچاس کے قریب تھی۔ ہر دس انسانوں کو ایک روٹی ملی اور وہ بھی شدید بھوک کے بعد۔ بایں ہمہ ہم میں سے بکثرت لوگوں نے اُسے کھانے سے انکار کر دیا۔ یہ انکار کسی احتجاج یا استکبار و تکبر کی بنا پر نہ تھا بلکہ دہشت اور خوف اس قدر شدید تھا کہ ہم لوگ اس کے سامنے بھوک کے احساس سے محروم ہو چکے تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد پھر وہی سپاہی رُوبی داخل ہوا اور ہمیں اسی طرح گالیوں سے نوازا جس طرح پہلے نوازا گیا تھا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں لوہے کی ایک لمبی سلاخ لے رکھی تھی اور بائیں ہاتھ میں پُرانے المونیم کا ایک ڈونگا جو کناروں تک چائے سے بھرا ہوا تھا۔ لوہے کی سلاخ سے اُس نے بعض ساتھیوں

کا سر زخمی کر دیا۔ اور جب وہ مار رہا تھا تو ڈونگے میں سے بہت سی چائے چھلک کر زمین پر گر گئی اور جو باقی بچی اُس کے بارے میں وہ پیشکش کے انداز میں اعلان کرنے لگا کہ" ڈونگے کے اندر باقی ماندہ چائے اسٹور نمبر ۶ کے اندر رہنے والے پچاس انسانوں میں تقسیم کر دی جائے"۔ اس مرتبہ ہم نے چائے پینے سے بھی انکار کر دیا۔ ہم ہر چیز کو ہیچ سمجھ رہے تھے۔ یہ چائے ظہر تک وہاں پڑی رہی۔ ردبی کو پتہ چلا کہ ہم نے اُس کی چائے نہیں پی تو وہ غصے میں ڈوبا ہوا آیا اور اُس نے ہم سب کی گرم گرم ضربوں سے تواضع کر ڈالی۔

اُس کے جانے کے بعد ایک اور سپاہی آیا جو اپنے ساتھی سے بھی زیادہ کریہہ اور کرخت تھا۔ اس نے یہ کہا کہ ہم بیت الخلا کی طرف نکلیں تاکہ ہم قضائے حاجت کر سکیں اور ہاتھ منہ دھو سکیں۔ نیز پیشاب کے بجائے ٹونٹی کا آبِ زُلال پئیں۔ ہمیں بیت الخلا کی طرف جانے کی بڑی خوشی ہوئی مگر خوشی پوری نہ ہو سکی

——— پہلی منزل میں بیت الخلا تھے۔ ہم اُن کی طرف دوڑ دوڑ کر چل دیے۔ راستے میں ہر طرف سے ہم پر کوڑے برستے یا کتے ہمیں کاٹتے۔ ہم میں سے ہر ایک شخص کو ایک ایک پاخانے کے اندر داخل کر دیا گیا۔ ہر پاخانہ کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ پوری جگہ بول و براز سے بھری ہوئی تھی۔ اور ستم یہ کہ اس میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں نے جب پاخانے کا دروازہ بند کر لیا اور قضائے حاجت کرنے لگا تو یک دم سپاہی نے دروازہ کھولا اور مجھے تازیانے مارنے لگا۔ میں سخت اُلجھن میں گرفتار ہو گیا اور یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ شخص مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ کالے رنگ کا چہرہ۔ دھنسی ہوئی آنکھیں۔ اُس کے مسوڑوں اور دانتوں کے اندر مدت دراز سے تعفن پیدا ہونے کی وجہ سے سڑانڈ بُری طرح پھوٹ رہی تھی۔ اور بدنما چہرے پہ برص کے سفید سفید داغ چمک رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر مجھے ڈاردن کی گمشدہ کڑی یاد آ گئی۔ بلکہ ناروے کا مشہور ادیب ابیسن بھی تصوّر میں جھلک گیا۔ اُس نے اپنا کریہہ المنظر دہن وا کیا اور چنگھاڑ کر کہنے لگا۔

کتے کے بچے باہر نکل آ۔

بابوجی۔ ذرا رُکیے۔

خسیس، کمینے..... کتے..... میرے سامنے بولتے ہو۔

ان الفاظ کے ساتھ اُس کا کوڑا پوری شدت اور گرمجوشی کے ساتھ میری خبر لے رہا تھا۔ میں اسٹور کی طرف لوٹ آیا۔ تازیانے کی تند و تیز ضربوں کے سوا جن کے نشانات میرے منہ، کندھوں اور پشت پر آج تک نقش ہیں

بیت الخلا رجانے سے مجھے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ میں نے دوسرے ساتھیوں کو دیکھا کہ وہ بھی بدحواس چوہوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑے پھرتے تھے، اور سپاہی جانوروں کی طرح اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔ اس گھٹی فضا کے اندر تازیانے گونج رہے تھے یا گتّے بھونک رہے تھے۔

تازیانوں کی آگ نے بیسیوں انسانی جسموں کو بھون دیا۔ میں ان سوختہ جسموں کے درمیان غیظ و غضب کے جذبات میں ڈوبا ہوا ڈھیر بنا پڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص بھی رفع حاجت نہ کر سکا۔ تمام چہرے گہرے سکوت میں ڈوب چکے تھے اور اُن پر سیاہی چھا رہی تھی۔ ایک شخص نے جھنجھلا کر ہاتھ اُٹھایا اور خود فراموشی کے عالم میں رو کر کہنے لگا: "یہ ظلم ہے"۔ "یہ ظلم ہے"۔ یہ سن کر نظربندوں میں سے ایک صاحب جو ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور اُن کے بالوں کی سفیدی بتا رہی تھی کہ بڑے جہاندیدہ اور تجربہ کار ہیں، بولے: "ہم سب جانتے ہیں کہ یہ ظلم ہو رہا ہے۔ آپ اپنے آپ کو قابو میں رکھیں۔ ایسا کوئی لفظ زبان سے نہ نکالیں۔ ہمیں کچھ خبر نہیں کہ آج ہم میں سے کس کی موت آ رہی ہے"۔ یہ "دانشورانہ" نصیحت سن کر اسٹور پر ہمہ گیر خاموشی کا پردہ تن گیا۔ اس پردے کو اگر کوئی چیز چاک کرتی تھی تو وہ باہر سے آنے والی تازیانوں کی گونج یا مظلوموں کی دبی دبی آہوں کی صدا تھی۔

ہم میں سے ہر شخص افکار کی دُنیا میں ڈوب گیا۔ میرے ذہن پر تو وہ ایک لفظ چھایا ہوا تھا جو قلعہ کی جیل میں مجھ سے سرکاری افسر نے کہا تھا، یعنی "خانگاہ والا شعبان"۔ اے شعبان تو کہاں ہے ــــ شعبان تیری وجہ سے میری ہلاکت ہونے والی ہے۔ تیرے بارے میں مجھ سے پوچھتے ہیں اور میں تجھے نہیں جانتا۔ تجھ سے میری ناواقفیت میرے لیے پیغام موت بن رہی ہے۔ شعبان! کوڑوں کی بارش کے اندر موت ایک بہت ہی خوفناک بات ہے۔ شعبان! شاید اس گھڑی تیری پیٹھ پر بھی تازیانے برس رہے ہوں گے۔ کون ہے تو اور کہاں ہے تو اے شعبان خانگاہ کے رہنے والے"۔

(باقی)

(بقیہ اشارات) سُن کر لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے، دیواروں سے ٹکریں مارنے لگے۔ فرش پر تڑپتے دکھائی دیے۔ بہترین رُومانی شاعری تو کجا، کیا جدید انقلابی شاعری بھی یہ سماں پیدا کر سکتی ہے؟

اقبال نے برصغیر کے پراگندہ فکر مسلمانوں کو اپنی شاعری سے سمیٹنے کی، (سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را) کوشش کی، ان میں اُمید پیدا کی، دین و سیاست کی ہم آہنگی کا درس دیا، خودی کا فلسفہ پیش کر کے اُن کے اندر قوتِ عمل کو پیدا کیا، وحدت الوجودی تصوف کے خواب آور اثرات سے اُن کو نکالا، قادیانیوں کے عقیدۂ اجرائے نبوت کا توڑ کیا، رہبانیت کی بیخ کنی کی، فرقہ وارانہ کشاکش کی دلدل سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ اُن کے سامنے مسلم قومیت کا جداگانہ تصور پیش کیا۔ اس تصور کے مطابق برصغیر میں مسلم ریاست کی تشکیل کی دعوت دی۔ اس ریاست کے بننے سے پہلے اس میں قائم ہونے والے نظامِ اسلامی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تشکیلِ فقہ جدید کی دعوت دی، خود فقہ اور شریعت کے مطالعہ کا آغاز کیا، دارالاسلام پٹھانکوٹ میں اپنے تجویز کردہ مسلم کلچر ادارے کے قیام کی کوشش کی، سیاسی جدوجہد میں مسلمانوں کی قیادت کرنے کے لیے قائد اعظم کی پشت پناہی کی۔ فقہی امور میں رہنمائی سید سلیمان ندوی مرحوم اور دوسرے نامور علماء سے لی، اسلام کو جدید دَور میں پیش کرنے اور مغربی علوم اور دینی علوم کی یکجائی سے مسلمان نوجوانوں کی ذہنی تربیت کرنے کے لیے نگاہِ انتخاب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پر پڑی۔ سیاست میں براہِ راست بہت ہی کم دخل دیا۔ البتہ بالواسطہ طور پر اثر انداز ہونے کی مختلف کوششیں مسلسل کیں۔ انتہائی سادہ زندگی گزاری۔ ضمیر کا کبھی سودا نہیں کیا۔ نت نئے موقف اختیار نہیں کیے۔ عام کردار ہر قسم کے اسکینڈلوں سے بے داغ رہا۔ اگرچہ بعض لوگ عنفوانِ شباب کے دَورِ طالب علمی کے متعلق چھان کرید میں لگے رہتے ہیں، مگر کسی لفظ یا کسی فعل سے کوئی ایسی چیز ثابت نہیں ہو سکی جسے شنیع کہا جا سکے۔ بس زیادہ سے زیادہ کچھ لوگ جو فوق العام حساسیت دکھاتے ہیں، وہ مضمون لکھ لکھ کر اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کچھ بُو سی آتی ہے، کوئی ٹھوس بات سامنے نہیں آئی۔

اقبال نے مسلمانوں میں انقلابی جذبہ اُبھارنے کے لیے فارسی اور اُردو شاعری میں جو کام کیا ہے وہ وسیع ہے۔ مگر دو تین مثالیں دیکھیے جنھوں نے اس کی پیدا کردہ رَو کو عوام تک پہنچا دیا ہے

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں — یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز — زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ ستیز

تو یہ تھا اقبال!

قدرت نے اسے جس بڑے مقصد کے لیے ایک موثر و مقبول شخصیت بنایا - آج عالم اسلام میں لوگ قافلہ در قافلہ اس کی طرف بڑھ رہے ہیں -

اس پورے کے پورے اقبال کو، اور اصل اقبال کو سامنے رکھ کر کوئی بتائے کہ کیسے اسے اشتراکی یا اسلامی سوشلزم کا داعی قرار دیا جا سکتا ہے - وہ رسولِ پاک کو جو مقام دیتا ہے وہ تاریخ اسلام کی جن درخشاں شخصیتوں کو اپنے فخرِ احترام میں سجا کر پیش کرتا ہے، اس نے زندگی میں جن لوگوں سے تعلق رکھا، جو اس کے دوست اور غمخوار تھے، جن لوگوں کو اس نے اپنا استاد و رہبر بنایا، جس طرح کے مشاغل رکھے، جن لوگوں سے وابستگیاں رکھیں جس طرح کی زبان اور تراکیب کو پسند کیا، آخر ان ساری چیزوں کی شہادت کیا ہے -

بہر حال مغالطہ انگیزوں کی اب تک کی مہمات جس طرح ناکام گئی ہیں، انشاء اللہ آئندہ بھی اقبال کی وسعت دار شخصیت کو کسی غلط سانچے میں نہیں ڈھالا جا سکے گا -

اور نہ یہی ممکن ہے کہ اس چھتنار درخت کے نیچے کوئی سرو و صنوبر پروان چڑھ سکے - اقبال کے مخالفین ہمیشہ احساس کہتری میں مبتلا رہیں گے -

ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ سرزمین پاکستان میں وہ کام کر ڈالا جائے جس کے لیے اقبال نے کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی" میں دن رات ایک کر دیے تھے - اور جسے ملت کا نصب العین اور برصغیر میں بننے والی مسلم ریاست کا مقصود قرار دیا تھا - کام تو ہو رہا ہے، مگر ایسے کام اگر سست رفتاری سے ہوں تو مخالف قوتوں کو ضرر رسانی کی مہلت مل جاتی ہے -

آخری جملہ یہی ہو سکتا ہے کہ خدا اپنے اس بندے پر ہزار در ہزار رحمتیں نازل کرے جس نے تہذیب مغرب کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا -

---

(۳)

اگر کسی دور کی تاریخ کا سارا عمل فطری طریق سے جاری ہو تو اسلامی نظامِ حیات اور اس کی برکات کا ظہور لازماً دعوتِ حق کے قدرتی برگ و بار کی صورت میں ہوتا ہے -

جماعتِ اسلامی اقامتِ دین کے اسی فطری راستے کی داعی ہے اور اپنے طور پر وہ کئی سال سے بھرپور

کام اسی مقررہ نہج پر کر رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پختہ اور محکم کام کا راستہ یہی ہے۔ اس راستے پر کام کرتے ہوتے ہمیں یا کسی اور قوت کو ہزار قسم کی مشکلات پیش آسکتی ہیں، بے شمار موانعات کا سامنا ہو سکتا ہے، سنگین آزمائشوں سے گذرنا پڑ سکتا ہے، مگر کلمہ طیبہ سے اُگنے والے شجرۂ طیبہ کو کسی طرح ختم نہیں کیا جا سکتا۔ خون اور لاشوں کی شکل میں جتنی قربانیاں پیش کی جاتی ہیں، وہ اُسے اور زیادہ نشوونما دیتی ہیں۔ وقتی طور پر اگر خونخوار جبریت اس مبارک پودے کو قطع بھی کر ڈالے تو یہ پھر پھوٹ آتا ہے، اس کی جڑیں اور بیج کبھی مرتے نہیں، وہ صدیوں بعد بھی کونپل نکال سکتے ہیں۔ اس پودے کو کاشت کرنے والے بے مزد کسان اپنے سامنے حکومتوں اور وزارتوں کو اُبھرتے اور مٹتے دیکھتے ہیں، جنگ و جدل کے سیلاب اس کے روبرو اُمڈتے ہیں، اقتصادی لحاظ سے کشادگی اور بحران کے بڑے بڑے دَور اُن کی نگاہوں سے گذرتے ہیں، عالمی قوتوں کی ساز باز کے رنگا رنگ کھیلوں کا وہ مشاہدہ کرتے ہیں، مگر ان سارے حوادث کو اپنے خدائی کام کے بالمقابل وہ اس طرح دیکھتے ہیں جیسے گلیوں کے آوارہ بچوں کی حرکات ہوں۔

اقامتِ دین کا کام اگر اس فطری طریق پر ایک بار پروان چڑھ جائے تو پھر اس کے آگے کوئی قوت نہیں ٹھہر سکتی۔ معاشرے کے اندر کی مزاحمتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں اور باہر کی شرپسند قوتیں بھی اپنے چنگال سمیٹ لیتی ہیں۔ فرد فرد کے اندر سے نور کا ایک چشمہ پھوٹ بہتا ہے، علمِ حق کی شعاعیں قریہ قریہ تک پھیل جاتی ہیں، جن لوگوں میں ایمان نہیں ہوتا ان میں ایمان پیدا ہو جاتا ہے اور جن لوگوں کا ایمان حالتِ خواب میں ہوتا ہے وہ بیدار ہو کر متحرک قوت میں بدل جاتا ہے۔ زندگی کے جس شعبے میں دو چار افراد دعوتِ حق سے سرشار ہو جاتے ہیں وہ اپنے دائرے کے لوگوں کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتے، کسی بستی میں اگر ایک صاحبِ ایمان بھی موجود ہوتا ہے تو وہ وہاں دب سکڑ کر پڑا نہیں رہتا بلکہ گرد و پیش کے بحیرۂ منجمد کے ہر قطرے سے نور و حرارت کا طوفان اُٹھا دیتا ہے۔ وہ فرد دراصل فرد نہیں ہوتا، بلکہ پورے ملک میں پھیلی ہوئی تحریک اس کی پشت پہ ہوتی ہے اور ہزاروں رفیقوں کی محبت و رفاقت اس کا سرمایۂ قوت ہوتی ہے۔

اقامتِ دین کی تحریک باطل سے ٹکراتی ہوئی جب آگے بڑھتی ہے تو قدم قدم پہ اس کا تنظیمی دائرہ بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ جب آخری مرحلہ آتا ہے تو ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والا کوئی آدمی تن تنہا نہیں ہوتا کہ وہ دیانت داری سے خیر و فلاح کی باتیں کرنے کے عزائم باندھے، مگر اس کے دست و بازو نہ ہوں۔ نہیں، بلکہ صاحبِ اقتدار کے پیچھے شمار

چشم و گوش ہوتے ہیں جو ملک کے چپے چپے میں روزمرہ کے حوادث اور جمہور کی پریشانیوں کو دیکھتے ہیں، اس کے لاکھوں دماغ ہوتے ہیں جو دین برحق کے متعین خطوط پر مسائل و معاملات کو سوچتے اور لمحہ بہ لمحہ اپنے مشورے ایک مرکز پر پہنچاتے ہیں۔ اس کے کتنے ہی ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں۔ وہ جہاں چل کر خود نہیں پہنچ سکتا، اس کے تحریکی ہمزاد بالکل بروقت وہاں پہنچ جاتے ہیں، اور جہاں جس کو سہارا دینا ہوتا ہے وہ درجنوں ہاتھ سہارا دینے کے لیے موجود ہوتے ہیں اور جہاں کسی ظالم کے ہاتھ کو پکڑنے کی ضرورت پیش آتی ہے، وہاں فوری طور پر بیسیوں ہاتھ ظالم قوت کے دست وپا کو ناقابلِ حرکت بنا دیتے ہیں۔ رشوت و خیانت کے واقعات ہوں تو ان پر نظر رکھنے والے رضاکار حاضر! چوری اور جرائم کا سلسلہ ہو تو مجرم کا راستہ روکنے کے لیے تیار۔ دفتری نظام میں بے قاعدگیاں اور بدعنوانیاں ہوں تو ان کا ازالہ کرنے کے لیے کمربستہ۔ آدمیوں کو پہچاننے کا مسئلہ ہو کہ کون حق کا ساتھ دینے والا، کون مزاحمت کرنے والا اور کون منافق ہے تو وہی رضاکار ایک ایک شخص کا ہسٹری شیٹ تیار کرنے کے لیے آن ڈیوٹی!

اسلام کی منظمانہ تحریک اپنے نفاذ کے لیے ایسی ہمہ گیر، فعال اور بابصیرت منظم قوت فراہم کرتی ہے، تب کہیں جاکر استخلاف فی الارض کا رتبہ بندگانِ خدا کو عطا ہوتا ہے۔

یہ طریقِ کار لمبا ہے۔ آج کل کے انقلابوں اور خونی طوفانوں سے اثر پذیر ذہن عجلت پسند ہو گئے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ کسی بھی طرح کام ہو، جو کچھ ہونا ہے جلدی ہو جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ چھوٹا سا ایک مقررہ ٹائم ٹیبل ہو کر دس بیس سال میں غلبۂ حق ہو جانا چاہیے۔

دوسرا بھی ایک راستہ ہے ضرور، مگر تاریخ میں وہ اتفاقی حیثیت رکھتا ہے۔ کبھی کبھار ایسے سلاطین نمودار ہوتے رہے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی مشیت نے یہ سعادت دی کہ وہ اپنی قوت سے کام لے کر اسلام کا امکانی حد تک احیا کریں، یا بندگانِ خدا کو عادلانہ اور رفاہی طریقوں سے فیض پہنچائیں۔ بسا اوقات بہ غیر معمولی صورت ایسے حالات میں واقع ہوئی کہ عرصہ دراز تک لوگوں پر حق و صداقت کے راستے بند رہے اور تاریکی اتنی گہری ہو گئی کہ روشنی کا ذوق بھی ختم ہونے لگا۔ کبھی ایسا ہوا کہ مظلومیت اور مایوسی کا دَور گزارنے والی کسی قوم کے لیے بہتری کی صورت پیدا کی۔ کبھی حالات کا نقشہ ایسا بن گیا کہ قوم چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہے اور بے شمار لیڈر طرح طرح کی بولیاں بولتے ہیں، مگر نہ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا ہے جو ساری قوم کو پکار کر اپنے گرد سمیٹ سکے اور اس کی قافلہ سالاری کرے، اور نہ یہی ممکن ہے کہ سارے لیڈر مفاد پرستی کے چکر سے نکل کر خیر و فلاح کے نکات پر جمع ہو

سکیں۔ ایسی صورت میں مشیت غیر معمولی طریق سے کسی بہتر آدمی کو آگے کر دیتی ہے۔

مثالیں بہت ہیں۔ انبیاء میں سے صرف ایک ہی مثال سیدنا یوسف علیہ السلام کی لی جا سکتی ہے۔ قدیم سلاطین میں سے قرآن نے ذوالقرنین کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ اُس کی عدل پسندی اور رفاہ عامہ سے دلچسپی واضح ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں سیدنا عمر بن عبدالعزیز شدید بگاڑ کے بعد بنو امیہ کے سلسلۂ سلاطین میں سے ہی اُبھرتے ہیں، مگر اپنے آپ کو فوراً خلفائے راشدین کا متبع بنا کر احیائے دین اور خدمتِ انسانیت کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ پھر اگر سلطان صلاح الدین کے زمانے کے حالات دیکھے جائیں کہ مسلم معاشرہ حروبِ صلیبیہ کے باوجود داخلی انتشار سے دوچار تھا تو حیرت ہوتی ہے کہ اُس شخص نے کس طرح صلیبی معرکوں کے خلاف ایک جانباز سپاہی کا فرض بھی ادا کیا اور خود مسلمانوں کے اندر ابھرنے والی بعض افتراقی قوتوں کو بھی سامنے کے ساتھ کچلا۔ اس شخص نے اقتدار کا پارٹ جس درویشی سے اعلیٰ درجہ کے معیار کے مطابق ادا کیا ہے وہ ہماری تاریخ کو روشن کرنے کا سبب ہے۔

اسی طرح تاتاریوں کی تاخت و تاراج کے آخری دَور میں مصر سے ایک غلام زادہ سلطان بیبرس جس شان سے اُبھرتا ہے اور مسلمانوں کے ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو از سر نو توانائی دیتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے مُردوں کو زندہ کر دیا جائے۔ اس شخص نے تاتاریوں کو بے بس کر دیا، اور اسلامی اقتدار کا احیا کیا۔ اور برصغیر میں متعدد مثالوں میں سے روشن ترین مثال اورنگ عالمگیرؒ کی ہے۔ بادشاہت کے اور بگاڑ تو جو کچھ تھے وہ تھے، مگر اکبری دَور نے تو اسلام کے عقائد و احکام سے لے کر آداب و شعائر تک ہر چیز کو بُری طرح کچلا اور اسلامی تہذیب کے پامال کردہ اجزاء کو ہندو قوم کے قدموں میں ڈال دیا۔ اس تباہ کن دَور کی خرابیوں کا کچھ ازالہ ہمایوں نے کیا، مگر مثبت پہلو سے یہ شرف اورنگ زیب عالمگیر ہی کو حاصل ہے کہ اس نے ہندوؤں کو کسی تعصب کا نشانہ بنائے بغیر اسلامی قانون اور اسلامی تہذیب کا ممکن حد تک پوری طرح نفاذ کیا۔

اس قسم کے ادوار جو بعض شخصیتوں کے ذاتی کارنامے کے طور پر تاریخ میں اُبھرے وہ اپنی روشنی پھیلا کر جب مٹے تو ایسے مٹے کہ بعد میں وہ رنگ ڈھنگ جاری نہ رہ سکا۔ تحریکی عمل اور شخصیتوں کے کام میں یہی فرق ہے۔

یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شخصی اقتدار سے کام لے کر جن ہستیوں نے اسلام کو رائج کیا یا جن سلاطین نے عدل اور خدمتِ عوام کی اعلیٰ مثالیں چھوڑیں، ان کا بھی ایک خاص طریق کار تھا۔ وہ حضرات اگر اس طریق کار کو اختیار نہ کرتے تو کبھی کامیاب نہ ہوتے۔ اس طریقِ کار کی چند اصولی باتیں عرض کرتا ہوں۔

۱۔ شخصی اقتدار چلانے کے لیے ویسے بھی کچھ زیادہ ہی مضبوط قوتِ فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے اور انقلابی کام کرنے یا اصلاح و فلاح کے اُمور کو انجام دینے اور منکرات کو مٹانے کے لیے بڑا آہنی عزم درکار ہوتا ہے۔ کوئی ڈھلمل آدمی، جس نے مطالعہ اور گہرے تفکر سے ایک وسیع ذہنی پس منظر مہیا نہ کیا ہو، بلکہ چاروں طرف سے گھیرا ڈال رکھنے والے افراد کی مرضیات کے ردّ و قبول میں پڑا ہے، قوتِ فیصلہ کو ضائع کر بیٹھتا ہے۔

۲۔ عام فلاحی و تعمیری پروگرام میں ایک حد تک، اور اسلام میں بطورِ خاص معاملات کو طے کرنے کے لیے سند، معیار اور اسوہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ معیار یا نمونہ پیشِ نظر ہو تو اس پر نگاہیں جما کر بآسانی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ کیا چیز کرنی لازم ہے اور کس چیز کا انسداد ضروری ہے۔ جہاں نہ سند ہو، نہ معیار، نہ اسوہ، وہاں کبھی کوئی ایک رائے خوشنما لگے گی اور کبھی کوئی دوسرا مشورہ من موہنا محسوس ہوگا۔

۳۔ تاریخ میں تن تنہا اُٹھ کر خدمتِ اسلام کرنے یا عدل و انصاف کا سکہ چلانے والے اصحاب کے لائحہ عمل میں مجرموں کی سرکوبی اور اس کے لیے تیز رفتار کارروائی (QUICK ACTION[1]) کا اصول بڑی اہمیت سے شامل رہا ہے۔ کسی نے بغاوت کے لیے جونہی سر اُٹھایا تو حکومت کی قوت اس کی گردن ناپنے کو موجود۔ کسی نے فساد فی الارض کا ارتکاب کیا تو اقتدار اس کے پیچھے سے بھی اور اس کے سامنے سے بھی سرکوبی کے لیے بر سرِ عمل۔

۴۔ جہاں رعایا کی پریشانی اور عوام کے کسی اضطراب کی اطلاع ملی، بلا تاخیر حکمران کا دستِ شفقت اُن کے سروں پر پہنچ کر تسکین کا سامان بن جاتا ہے۔

۵۔ سب سے اہم امر یہ ہے کہ درباریوں یا مشیروں یا کارندوں میں سے اگر فرمانروا کو کسی کے متعلق یہ اندازہ ہوگیا کہ اُس نے منشائے حکومت کے خلاف کوئی اقدام کیا، یا کسی پالیسی کا رُخ ذرا سا بدل کر اُسے عوام کے لیے وجہِ پریشانی بنا دیا ہے، یا کوئی غلط مشورہ دیا ہے اور غلط منصوبہ منوایا ہے، یا اُس نے غلط کار ملازموں یا مجرم شہریوں میں سے کسی کی پشت پناہی کی ہے یا کسی کو اپنی اوٹ میں لیا ہے تو پھر بلا رو رعایت اُسے اُٹھا کے ایک طرف پھینک دیا جاتا تھا، اور بالعموم عبرت ناک سزا بھی دی جاتی تھی۔

---

[1] یہاں ایک مؤثر پنجابی محاورہ نقل کرنا مفید ہوگا: "ہلیا نئیں کہ سلیا نئیں" (مراد یہ کہ جونہی کسی سانپ نے ذرا جنبش کی، نیزے یا تلے سے اُسے فوراً چھید دیا)۔

سلاطینِ عادل کی کامیابی کا ایک راز ان کی مردم شناسی میں پنہاں ہے۔ وہ کام کے آدمیوں اور قابل اعتماد مشیروں اور بصیرت مند درباریوں کا صحیح انتخاب کرتے ہیں۔ وہ ایسے لوگوں کو اپنے گرد جمع کرتے ہیں جو اُن کے اختیار کردہ لائحہ عمل کو کامیاب کرنے اور اُن کے طے کردہ مقاصد کو دل و جان سے حاصل کرنے میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیں۔

یہ چند ضروری شرائط اگر پوری نہ ہوں تو تاریخ کی گواہی یہی ہے کہ اچھے سے اچھے مقاصد رکھنے والی شخصیتیں بھی ناکام ہو گئیں۔

تاریخ کے بہت ہی پیچیدہ اور لاینحل حالات میں مشیت اس قسم کے خصوصی انتظامات کرتی رہتی ہے تاکہ انسانیت بالکل غارت ہو کر نہ رہ جائے، لوگ بالکل معطل اور بے جان نہ ہو جائیں، ان کا یقین حق و انصاف سے نہ اُٹھ جائے اور وہ دعوت اسلامی کی علمبرداری کے قابل ہی نہ رہیں۔

قدرت کے اس خصوصی انتظام میں ایک ہی اساسی کلیہ واجب القبول ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی بھی سچے مسلمان کو مخصوص حالات کے تحت اقتدار کی باگ ڈور سونپ دی جائے تو اُس کے لیے ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ حاصل شدہ قوت کو خدا اور رسول کے احکام و حدود سے منحرف ہو کر استعمال کرے اور ساری قوت کو اپنے مفاد و آرام کا ذریعہ بنا لے، بلکہ اس کا لازمی فریضہ یہ ہے کہ وہ دین کا علم حاصل کرے، اس کے احکام کے مطابق اقتدار کو دعوتِ دین کے فروغ، بندگانِ خدا کی اخلاقی اور معاشی فلاح، ان کو منکرات اور جرائم سے نجات دلانے اور ایک ایسی فعال، متحرک اور منظم ملت اسلامیہ میں بدلنے کی کوشش کرے جو اقامتِ دین کی ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے کے قابل ہو اور دنیا بھر کے انسانوں کے سامنے دینِ مبین کی صداقت کی گواہی دے سکے۔

ہاں ایسے مسلمان کو اس امر کا خیال بھی رکھنا چاہیے کہ اگر وہ اسلام کی برتری کے عزائم ظاہر کرتا ہے اور خرابیوں کی بیخ کنی اور ظالموں کی سرکوبی اور فواحش و منکرات کے انسداد کا اعلان کرتا ہے، وہ اگر اقامت صلوٰۃ یا ایتائے زکوٰۃ، یا کسی دوسری تعمیری و اخلاقی اسکیم کو سامنے لاتا ہے تو اُسے اپنے دعووں کو پورا کر کے دکھانا چاہیے، ورنہ اگر اس کی بہبات معاشرے کے فاسد عناصر کے سامنے ایک ڈھیلی ڈھالی سفارش بن کر رہ گئی اور اس کی شخصیت بے وزن ہو کر رہ گئی تو یہ کمزوری خود اسلام اور اس کے مقاصد کے لیے نقصان دہ ہو گی، اور اگر کسی دوسرے طریقے سے کام کرنے والے لوگ اُس کے لیے کام کر رہے ہوں گے یا کرنا چاہیں گے تو ان کا جادۂ سعی زیادہ کٹھن ہو جائے گا۔

اسلام خدا کی طرف سے بندوں کے لیے ایک سفارش یا نعوذ باللہ ایک گذارش نہیں ہے، وہ فرمان و ہدایت ہے۔ پس خدا کے جو بندے خدا کے دین کے لیے کام کرنے چلے ہوں وہ احکام دین کو سفارش یا گذارش بنا کے پیش نہ کریں۔ کوئی کام اگر کرنے کا ہے اور اس کے کرنے کی قوت حاصل ہے تو جرأت مردانہ سے اُسے کر ڈالیں، اور قوت حاصل نہیں ہے تو پھر دعوتِ دین کے ابتدائی مراحل طے کر کے قوت حاصل کرنے کی فکر کریں۔

تاریخ کے جھروکے میں سے جھانک کر مناظر رفتہ کو دیکھتے ہوئے کچھ اسباق جو اپنے ذہن نے اخذ کیے، بیان کر دیے گئے ہیں۔

لیکن جہاں تک جماعت اسلامی کا معاملہ ہے، وہ کسی بھی حکومت کے اچھے عزائم، دینی رجحانات اور فلاحی و تعمیری پروگراموں کو سراہتے ہوئے، خود اپنے لیے اسی طریقِ کار کو صحیح سمجھتی ہے جو اقامتِ دین کا فطری طریق کار ہے۔ یعنی لوگوں کو خدا کے دین کی دعوت دیتے رہنا ہے، جو اسے قبول کریں ان کو منظم کرنا، جو لوگ منظم ہوں ان کی تربیت کرنا ہے، اور اس طرح جو قوت تیار ہوتی جائے اُسے فروغ دعوت کی مہم میں شریک کرنا ہے اور اُس کے ذریعے معاشرے میں تبدیلی کی ایک تحریک کو موجزن کرنا ہے۔ بحمد اللہ کہ اس کام کا تسلسل کبھی نہ ٹوٹا ہے، نہ ان شاء اللہ ٹوٹے گا۔

اس دوران میں اگر ایک ایسی قوت نمودار ہوئی ہے جس نے ظلم و خیانت کے شش سالہ دور کو ختم کر دیا، اور اچھے عزائم رکھتی ہے، اور شدید مزاحمتوں اور پیچیدگیوں کے باوجود اسلام کی خدمت کا دم بھرتی ہے تو ہم اس کے لیے جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ دُعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے مختصر دور میں کچھ اچھے اور مفید اقدامات کر سکے۔

ساتھ ہی ہم اپنے آپ کو اس مغالطے میں نہیں ڈال سکتے کہ ہماری دعوتی و تحریکی ذمہ داریاں ختم ہو گئیں ہیں۔ یہ معاشرہ جس میں چوری چکاری ہے، فحاشی و عیاشی ہے، رشوت و خیانت ہے، مار دھاڑ ہے، غنڈہ گردی اور رکردہ آزاری ہے، نفع اندوزی اور گراں بازاری ہے، تفرقہ پسندی اور محاذ آرائی ہے، جہالت اور غلاظت ہے، قانون شکنی اور بے ضابطگی ہے، اس کا ہمہ جہتی بگاڑ ایسا نہیں کہ عوامی دائروں میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر دعوتِ اصلاح کی ضرورت ختم ہو چکی ہو۔ بلکہ حالات گواہی دے رہے ہیں کہ یہ ضرورت اُس سے کہیں زیادہ ہے جتنی ہم سمجھتے تھے۔

میرا منشا یہ ہے کہ دین سے محبت رکھنے والوں میں جتنا بھرپور احساس ذمہ داری ہونا چاہیے اور برسر عمل رہے اور اس کے زیر اثر جو کام ہونا چاہیے وہ صبر و سکون سے جاری رہے۔

تفہیم القرآن

پارۂ اوّل — سورۂ فاتحہ — سورۂ بقرہ — [illegible] — [illegible]

سورۂ لقمان — سورۂ یٰسین — [illegible] — [illegible] — [illegible]

سورۂ [illegible] — [illegible]

تفسیر تیسواں پارہ

ادارہ ترجمان القرآن [illegible] سے
[illegible] شائع ہو [illegible]

ولایتی کاغذ — آفسٹ طباعت — خوبصورت [illegible]

[illegible]

[illegible]

ادارہ ترجمان القرآن - اچھرہ - لاہور

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۲۳۰

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بنیادی حقوق

[illegible]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور